پنڈورا کا پٹارا



پنڈورا کا پٹارا

یُونانی کہانیاں

سیف الدّین حسّام

فہرست

چُڑیل کا سر

بہت دنوں کی بات ہے، ایک بادشاہ کی کسی آدمی سے دُشمنی ہو گئی۔ بادشاہ نے اس آدمی کو قتل کروادیا اور اس کی بیوی دانائے اور چھوٹے بچّے پرسیَس کو لکڑی کے صندُوق میں بند کر کے سمندر میں بہادیا۔

صندُوق بہتا رہا اور بچّہ اور اس کی ماں بھُوکے پیاسے، ڈرے سہمے اس کے اندر لیٹے رہے۔ دو دن بعد سمندر کی لہروں نے صندُوق کو ایک جزیرے کے ساحِل کے پاس پہنچادیا۔ یہاں ایک مچھیرے نے جال ڈال رکھا تھا۔ صندُوق جال میں پھنس گیا اور مچھیرے نے اُسے باہر نکال لیا۔

مچھیرا بہُت نیک دل آدمی تھا۔ وہ پرسیَس اور اس کی ماں دانائے سے بڑی مہربانی سے پیش آیا۔ وقت گُزرتا گیا۔ پرسیَس جوان ہو گیا۔ وُہ صحت مند اور خُوب صُورت تھا۔ اور جیسا کہ اُن دِنوں دستور تھا، اُس نے تلوار چلانے میں بھی

مہارت حاصل کی تھی۔ اس جزیرے کا نام سیری فس تھا اور مچھیرے کا بڑا بھائی پولی دکتس یہاں کا حاکم تھا۔ لیکن وہ اپنے بھائی جیسا نیک دِل نہیں تھا۔ وہ بڑا ہی ظالم تھا اور لوگوں کو تنگ کر کے خُوش ہوتا تھا۔ جب اُس نے دیکھا کہ پرسیَس بہت خُوب صُورت اور بہادر جوان ہے تو اُس نے فیصلہ کیا کہ کِسی طرح اِسے ختم کیا جائے۔ اس کام کے لیے اس کی سمجھ میں یہ ترکیب آئی کہ پرسیَس کو دُور کسی ایسی مُہم پر بھیجا جائے، جہاں س وہ زندہ واپس نہ آ سکے۔ پولی دکتس نے حکم دیا کہ پرسیَس کو دربار میں پیش کیا جائے۔ جب وہ آ گیا تو پولی دکتس نے اُس سے کہا:

میں نے اور میرے بھائی نے تُم پر بُہت مہربانیاں کیں ہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ تُم ہمارے کام آؤ۔"

پرسیَس نے ہاتھ باندھ کر عرض کی "میری جان حاضر ہے۔ حضُور حکم کریں۔"

پولی دکتس بولا "تُم بُہت بہادر اور حوصلہ مند ہو۔ میں نے تُمہارے لیے ایسا کام سوچا ہے کہ تُمہاری بہادری کی بھی آزمائش ہو جائے گی اور میرا ایک ضروری کام بھی ہو جائے گا۔ تُمھیں پتا ہو گا کہ میں عنقریب شادی کرنے والا ہوں۔ میں

چاہتا ہوں کہ اپنی دُلہن کو ایسا تحفہ پیش کروں جو بُہت ہی انوکھا ہو۔ “

پرسیَس بولا۔ ”فرمایئے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟ “

”میں اپنی دُلہن کو مدوسا چُڑیل کا سر تُحفے میں دینا چاہتا ہُوں۔ اگر تم یہ سر لا دو تو ہماری مہربانیوں کا بدلہ بھی چُکا دو گے اور میں تُمھیں بہت سی دولت بھی دوں گا۔“

پرسیَس بولا۔ ”عالی جاہ، میں کل ہی روانہ ہو جاؤں گا۔ “

”لیکن ایک بات کا خیال رہے۔ سر بالکل صحیح سلامت آنا چاہیے۔“ پولی دکتس نے کہا۔

جب پرسیَس دربار سے چلا گیا تو پولی دکتس نے ایک زور دار قہقہہ لگایا۔ اُسے معلُوم تھا کہ مدوسا چُڑیل کا سر کاٹنا نا مُمکن ہے۔ وہ پرسیَس کی بے وقوفی پر بُہت ہنسا۔ شہر کے لوگوں نے بھی جب یہ سُنا کہ پرسیَس مدوسا چُڑیل کا سر لانے پر آمادہ ہو گیا ہے تو وہ بُہت ہنسے اور اُس کی موت کی خبر کا اِنتظار کرنے لگے۔ سارے

ملک میں صِرف نیک دِل مچھیرا ہی ایک ایسا شخص تھا جسے پر سیَس اور اُس کی ماں سے ہمدردی تھی۔

مدوسا اُس زمانے کی تین خوف ناک چُڑیلوں میں سے ایک تھی۔ یہ تینوں چُڑیلیں سگی بہنیں تھیں اور اِتنی ڈراؤنی تھیں کہ کِسی کو اُنہیں دیکھنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ وہ تھیں تو عورتیں لیکن اُن کے جِسم اژدہے کے سے تھے۔ جِسم کی کھال لوہے کی بنی ہوئی تھی۔ سر پر بالوں کے بجائے ایک سو سانپ تھے جو ہر وقت پھنکارتے اور بل کھاتے رہتے۔ اُن کی زبانیں مُنہ سے باہر نِکلی رہتیں۔ دانت شیر کی طرح لمبے اور باہر کو نکلے ہُوئے، ہاتھ درندوں کے پنجوں کے سے اور تانبے کے بنے ہوئے تھے۔ اُن کے بڑے بڑے پَر بھی تھے جو سونے کے بنے ہوئے تھے اور دھوپ میں جگمگ جگمگ کرتے تھے۔

اگر کسی اِنسان کی نظر اُن میں سے کِسی چُڑیل پر پڑ جاتی تو وہ فوراً اِدھر اُدھر چھُپنے کے لیے بھاگتا۔ اس لیے نہیں کہ اُن کے سروں پر خوف ناک سانپ تھے بلکہ اس لیے کہ جس انسان کی نظر اُن کے چہرے پر پڑ جاتی، وہ فوراً پتھّر کا بن جاتا

تھا۔

پر سیَس کے لیے یہ کتنا مُشکل کام تھا۔ لیکن اُس نے اس کا ذِکر اپنی ماں سے کیا، ورنہ وہ ہر گز اپنے بیٹے کو اس مُہم پر نہ جانے دیتی۔

اس نے اپنی تلوار اور ڈھال لی اور ایک کشتی میں بیٹھ کر تھوڑی دُور ایک پُر سکون اور خاموش مقام پر چلا گیا۔ وہ کچھ پریشان تھا اور گہری سوچ میں کھویا ہُوا تھا۔ کہ ایک آواز آئی :

"پر سیَس کیا بات ہے؟ اُداس کیوں ہو؟"

پر سیَس نے سر اُٹھایا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک خُوب صُورت نوجوان پاس کھڑا ہے۔ اس کے سر پر عجیب سی ٹوپی تھی۔ ہاتھ میں ایک مُڑا ہوا ڈنڈا تھا۔ پہلو میں تلوار لٹکی ہوئی تھی اور وہ بھی مُڑی ہوئی تھی۔ وہ بہت ہی خُوش و خُرّم نظر آ رہا تھا۔ اُسے دیکھ کر پر سیَس کا حوصلہ بڑھا اور وہ بولا :

"میں ایک بہت ہی خطرناک مُہم کے متعلّق سوچ رہا ہُوں، جس پر میں عن

قریب جانے والا ہُوں۔"

اجنبی نوجوان بولا۔ "میں ایسے بہت سے نوجوانوں کی مدد کر چُکا ہُوں جو ایسی خطرناک مہموں پر گئے ہیں۔ شاید تم نے میرا نام سُنا ہو۔ مجھے مرکری بھی کہتے ہیں، لیکن میرا اصل نام کوئِک سِلور ہے۔ شاید میں تُمہاری مدد کر سکوں۔ بتاؤ تو سہی۔"

پرسیَس نے اجنبی کے لہجے سے اندازہ لگا لیا کہ وُہ بھروسے کا آدمی ہے۔ اُس نے اُسے بتایا کہ پولی دکتس نے مدوسا کا سر منگوایا ہے اور سُننے میں یہ آیا ہے کہ جو کوئی بھی اُس چُڑیل کے چہرے کو دیکھتا ہے، پتھّر کا بن جاتا ہے۔" اجنبی مُسکرا کر بولا۔ "اور تم ابھی پتھّر بننا نہیں چاہتے۔ ابھی تو تُمہارے کھانے کھیلنے کے دن ہیں۔ ابھی کیا ضرورت ہے مرنے کی؟"

پھر اُس نے پرسیَس کو بتایا کہ اِس مُہم میں کام یابی کے لیے پہلے تین بھُوری عورتوں کو تلاش کرنا ہو گا۔

پرسیَس بولا۔ "بھُوری عورتیں! وہ کِس لیے؟ میں نے تو کبھی اُن کے متعلّق نہیں

سُنا۔"

اجنبی بولا۔ "وُہ بڑی عجیب عورتیں ہیں۔ اُن کی صرف ایک آنکھ ہے اور ایک ہی دانت، جنہیں وہ باری باری استعمال کرتی ہیں۔ لیکن وہ سُورج یا چاند کی روشنی میں نظر نہیں آتیں۔ تاروں کی مدھم روشنی میں یا شام کے وقت دِکھائی دیتی ہیں۔"

پرسیَس غُصّے سے بولا۔ "لیکن مُجھے تو مدوسا چُڑیل کو تلاش کرنا ہے۔ میں اِن عورتوں کی تلاش میں وقت کیوں ضائع کروں؟"

اجنبی بولا۔ "اِس سے پہلے کہ تُم چُڑیلوں تک پہنچو، تُمہیں کئی کام کرنے پڑیں گے۔ سب سے پہلے اپنی اس ڈھال پر پالش کرو۔ اِسے اِتنا چمکاؤ کہ تُمہارا چہرہ اس میں صاف نظر آئے۔" یہ بات پرسیَس کی سمجھ میں نہ آئی۔ اس کا خیال تھا کہ ڈھال کا چمک دار ہونا اتنا ضروری نہیں جتنا مضبوط ہونا۔ لیکن اِس کے باوجود اس نے اجنبی کے کہنے پر عمل کیا۔ پوری محنت سے ڈھال پر پالش کیا اور اُسے اِس قدر چمکایا کہ وہ چودھویں کے چاند جیسی روشن نظر آنے لگی۔ اُس نے اپنے چہرے کا عکس ڈھال میں دیکھا تو خُوشی سے مُسکرا دیا۔ کوئیک سِلوَر نے بھی اپنا چہرہ

دیکھا۔ واقعی ڈھال میں سب کُچھ نظر آرہا تھا۔ پھر اُس نے اپنی مُڑی ہُوئی تلوار اُتاری اور پرسیَس کی تلوار لے کر اپنی تلوار اُس کے پہلو میں لٹکا دی۔ پھر بولا:

"یہ تلوار لوہے اور تانبے کو بھی کاٹ سکتی ہے۔ آؤ اب چلیں اور بھُوری عورتوں کو تلاش کرو۔"

یہ کہہ کر کوئیک سِلوَر چلنے لگا۔ پرسیَس بھی اُس کے پیچھے ہو لیا۔ لیکن سِلوَر اِتنا تیز چل رہا تھا کہ پرسیَس کو اس کا ساتھ دینا مُشکل معلُوم ہو رہا تھا۔

چلتے چلتے پرسیَس کی نظر سِلوَر کے پاؤں پر پڑی تو اُس نے ایسا محسُوس کیا جیسے اُس کے جوتوں میں پَر لگے ہوں۔ اُسے سِلوَر کے سر پر بھی دو پَر نظر آئے۔ لیکن جب اُس نے دوبارہ غور سے دیکھا تو سمجھا کہ وہ غَلَطی پر تھا۔

سِلوَر نے دیکھا کہ پرسیَس کا سانس پھُولا جا رہا ہے تو اُس نے اپنا مُڑا ہوا ڈنڈا اُسے دیتے ہوئے کہا۔ "لو یہ تُم لے لو۔ تُمھیں اِس کی مُجھ سے زیادہ ضرُورت ہے۔"

اب جو پرسیَس نے دیکھا تو سِلوَر کے جوتوں میں پَر لگے ہوئے دیکھائی دیے۔ وہ

بولا ”اگر مُجھے ایسے پَروں والے جوتے مِل جائیں جیسے آپ پہنے ہوئے ہیں تو میں زیادہ تیز چل سکوں گا۔“



سِلوَر بولا ”کوشش کرتے ہیں کہ تُمہیں بھی ایسے ہی جُوتوں کی ایک جُوڑی مل جائے۔“

ڈنڈا ہاتھ میں لیتے ہی پرسیَس اپنے آپ کو پہلے سے زیادہ طاقت ور محسوس کرنے

لگا اور اُس کی رفتار تیز ہو گئی۔

آخر کار اُنہیں تین بھُوری عورتیں مل گئیں۔ پرسیَس یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ اُن تینوں کے پاس صِرف ایک آنکھ تھی، جسے وہ باری باری اِستعمال کر رہی تھیں۔ اُن سے کوئی بات پوچھنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ سوال ایسے موقع پر کیا جائے جب آنکھ ایک سے دُوسری کی طرف جا رہی ہو اور کِسی کے پاس نہ ہو۔

اُنہوں نے نہایت ہوشیاری سے ایسے ہی موقع پر ان سے پرسیَس کی مُہم کے متعلّق سوال کیا۔ اُن عورتوں نے اُنہیں بتایا کہ اِس مُہم کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ وہ تین پریوں سے ملیں جو اُنہیں تین ایسی چیزیں دیں گی جن کے بغیر یہ مُہم کامیاب نہیں ہو سکتی۔ یہ تین چیزیں تھیں، ایک جادُو کی تھیلی، اُڑنے والے جُوتوں کا ایک جوڑا اور ایک ٹوپی جسے پہن کر اِنسان دوسروں کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

اب یہ دونوں پریوں کے پاس پہنچے۔ تینوں پریاں جوان اور خُوب صُورت تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئیک سِلوَر کو پہلے سے جانتی تھیں۔ سِلوَر نے اُنہیں

پرسیَس کی مُہم کے متعلّق بتایا تو وہ فوراً مدد پر آمادہ ہو گئیں۔

سب سے پہلے وہ جادُو کی تھیلی لے کر آئیں۔ یہ ہرن کی کھال کی بنی ہوئی ایک چھوٹی سی تھیلی تھی جس پر نہایت خُوب صُورت اور رنگا برنگا دھاگوں سے کشیدہ کاری کا کام کیا ہوا تھا۔

اس کے بعد وہ ایک پیارا سا جُوتوں کا جوڑا لائیں۔ ان پر بھی نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ لیکن سب سے زیادہ دلچسپ چیز وہ پَر تھے جو جُوتوں کی ایڑیوں کے دونوں طرف لگے ہوئے تھے۔

سِلوَر بولا۔ ''انہیں پہنو۔۔۔!''

پرسیَس ایک جُوتا پہننے کے لیے جھُکا اور دُوسرا اُس نے پاس ہی زمین پر رکھ لیا۔ لیکن ابھی اُس نے جُوتا پوری طرح پہنا بھی نہ تھا کہ دوسرے جُوتے نے پَر پھیلائے اور ہوا میں اُڑنے لگا۔ قریب تھا کہ جوتا بہت اُونچا چلا جاتا کہ سِلوَر نے لپک کر اُسے پکڑ لیا اور پرسیَس سے کہا:

اِتنی سُستی سے کام نہیں چلے گا۔ ذرا تیزی دِکھاؤ۔ اگر میں اسے نہ پکڑتا تو پرندے اِس سے ڈر کر درختوں میں جا چھُپتے۔"

جب پرسیَس نے دونوں جوتے پہن لیے تو اُسے یُوں محسُوس ہوا جیسے اُس کے لیے زمین پر ٹھہرنا مُشکل ہو رہا ہے۔ پَروں والے جوتے اُسے بار بار اُوپر اٹھاتے اور وہ بڑی مشکل سے اُن پر قابو پاتا۔

سِلوَر بولا۔ "شروع شروع میں اِن پر قابو پانا بُہت مُشکل ہوتا ہے۔ لیکن ابھی تو تُمھیں جادُو کی ٹوپی کا کمال دیکھنا ہے۔ "

پریوں نے پرسیَس کے سر پر ٹوپی رکھی تو عجیب تماشا ہوا۔ ایسا تماشا اُس نے اُس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ ٹوپی اوڑھتے ہی وہ غائب ہو گیا۔

سِلوَر نے کہا۔ "تم کہاں ہو، پرسیَس؟ "

پرسیَس حیران ہو کر بولا۔ "میں یہیں ہوں، جہاں پہلے کھڑا تھا۔ کیا بات ہے؟ کیا میں تُمھیں نظر نہیں آتا۔ "

سِلوَر بولا ”نہیں۔ میں تُمہیں نہیں دیکھ سکتا۔ وُہ چُڑیلیں تُمہیں دیکھ سکیں گی۔ اب جلدی کرو اور اِن پَر دار جوتوں سے اُڑنے کی مشق کرلو۔ “

جُوں ہی کوئنک سِلوَر نے یہ کہا، اُس کے اپنے سر کی ٹوپی کے پَر بھی کھُل گئے اور اگلے ہی لمحے وہ زمین سے سینکڑوں فٹ اُوپر ہوا میں اُڑنے لگا۔

چاند نِکلا ہوا تھا۔ پرسیَس کا دِل چاہا کہ وہ آسمان کی بُلندیوں میں، چاند کی طرف اُڑتا چلا جائے اور ساری عُمر یوں ہی اُڑتا رہے۔ بڑا مزا آرہا تھا اُسے۔ پھر اُس نے نیچے نظر ڈالی تو زمین اُسے تیزی سے پیچھے بھاگتی ہوئی نظر آئی۔

چاند کی روشنی میں اُسے دریا، جھیلیں، پہاڑوں کی برف سے ڈھکی چوٹیاں، جنگل، شہر اور شہروں کی عمارتیں چاندی کی طرح چمکتی نظر آئیں۔ اِس کے علاوہ اُسے سیری فس جزیرہ بھی نظر آیا۔ اُسے فوراً اپنی ماں کا خیال آیا اور اِس خیال کے آتے ہی اُس کی ہمّت اور بڑھ گئی۔

فضا میں اُڑتے ہوئے اُسے بادل اِس طرح نظر آرہے تھے جیسے پانی کی بڑی بڑی عمارتیں ہوں لیکن جب وہ اُن میں سے گزرتا تو وہ بھیگ جاتا اور اُسے سردی لگنے

لگتی۔

اُڑتے ہوئے اُس نے محسوس کیا کہ سِلوَر کے علاوہ کسی اور کے پَروں کی بھی آواز آرہی ہے۔ اُس نے سِلوَر سے پوچھا تو وہ بولا۔ "ہاں، یہ میری بہن ایتھنے ہے۔ اس کے بغیر ہماری یہ مُہم کامیاب نہیں ہو سکتی۔ "

پرسیَس نے حیران ہو کر پُوچھا۔ "وہ کیسے ؟ "

سِلوَر نے کہا۔ "اس لیے کہ وہ تُمہیں اب بھی دیکھ سکتی ہے۔ جو چیزیں کسی کو نظر نہ آئیں، اُسے دِکھائی دیتی ہیں۔ چُڑیلوں پر سب سے پہلے اُسی کی نظر پڑے گی۔ "

اب وہ سمندر پر اُڑ رہے تھے۔ ٹھاٹھیں مارتی ہوئی لہروں کا نظّارہ اُن کے لیے بُہت ہی دِل چسپ تھا۔ دُور ساحِل پر نظر پڑتی تو لہریں جھاگ بن کر مٹّی میں جذب ہوتی نظر آتیں۔

اچانک پاس سے کسی کی آواز آئی۔ "پرسیَس !وہ رہیں چُڑیلیں۔ "

پرسیَس بولا۔ "کہاں ؟ مُجھے تو نظر نہیں آتیں۔ "

”وہ جو سامنے جزیرہ نظر آ رہا ہے، اُس کے ساحِل پر۔ “

سِلوَر نے کہا۔ ”میں نے تُمھیں بتایا تھا نا کہ ایتھنے کو ہی سب سے پہلے چُڑیلیں نظر آئیں گی۔“

اب پر سیَس نے اِرد گِرد نظر دوڑائی۔ دُور سمندر کے درمیان اُسے ایک جزیرہ نظر آیا جس کے ساحِل پر سمندر کی لہریں جھاگ بن کر حملہ کر رہی تھیں۔ جزیرے کے جنُوب کی طرف ریتلی زمین تھی۔ تینوں نے اُدھر کا رُخ کیا۔

اب پر سیَس کی نظر چُڑیلوں پر پڑی۔ چاندنی میں اُن کا فولادی جسم خُوب چمک رہا تھا۔ وہ ریت پر سوئی ہُوئی تھیں، جیسے لوہے کے پہاڑ ہوں۔ اُن کے پنجے پھیلے ہوئے تھے جیسے خواب میں کِسی کو چیر پھاڑ رہی ہوں۔

جب پر سیَس کی نظر چُڑیلوں کے سروں پر لہراتے سانپوں پر پڑی تو وہ سہم گیا۔ سانپ بل کھا رہے تھے، پھُنکار رہے تھے اور زبانیں باہر نکال رہے تھے۔

وہ تو اچھا ہوا کہ چُڑیلوں کے چہرے دوسری طرف تھے، ورنہ پہلے ہی پر سیَس کی

نظر اُن پر پڑتی۔ وہ پتھّر کا بن کر زمین پر آ رہتا۔

سِلوَر بولا۔ ”اچھا موقع ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اِن میں سے کوئی جاگ جائے۔ “

پر سیَس نے اپنی تلوار نکالی اور ذرا نیچے اُڑتے ہوئے پوچھا: ”اِن میں مدوسا کون سی ہے؟ مُجھے تو تینوں ایک سی نظر آ رہی ہیں۔ “

ان تینوں چُڑیلوں میں مدوسا ہی وہ چُڑیل تھی جِس کا سر کاٹا جا سکتا تھا۔ باقی دونوں کے سروں کو کاٹنا ناممکن تھا۔ اُنہیں جادُو کی تلوار بھی نہیں کاٹ سکتی تھی۔

پر سیَس نے مدوسا کے متعلّق پُوچھا تو ایتھنے نے کہا :

”ذرا دھیان رکھو! آہستہ بولو! اِن میں سے ایک پہلو بدل رہی ہے۔ کہیں اُٹھ نہ جائے۔ یہی مدوسا ہے۔ اگر اُس نے اپنا مُنہ اِدھر کر لیا تو اُسے دیکھنا نہیں۔ ہاں، اپنی ڈھال میں اس کا عکس دیکھ لینا۔ “

اب پر سیَس کی سمجھ میں آیا کہ سِلوَر نے اُسے ڈھال کو خُوب چمکانے کے لیے کیوں کہا تھا۔

پر سیَس نے ڈھال میں چُڑیل کا مُنہ دیکھا اور خوف سے سہم گیا۔ اِتنا خوف ناک چہرہ اُس نے آج تک نہ دیکھا تھا۔ اس کے سر پر پھنکارتے اور بل کھاتے ہوئے سانپ اسے اور بھی خوف ناک بنا رہے تھے۔ مدوسا ابھی تک سوئی ہُوئی تھی۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں، لیکن اس کے شیر جیسے دانت مُنہ سے باہر نکلے ہوئے تھے۔ اُس نے اپنا ایک پنجہ ریت پر پھیلا رکھا تھا۔

سِلوَر بولا۔ ''اب موقع ہے۔ وار کرو۔ ''

ایتھنے کی آواز آئی۔ ''لیکن اپنے آپ کو ذرا قابُو میں رکھنا۔ زیادہ جوش میں نہ آنا۔ اگر تُمہارا پہلا ہی وار کارگر نہ ہُوا تو پھر جان بچانی مُشکل ہو جائے گی۔'' پر سیَس آہستہ آہستہ نیچے کو آیا اور مدوسا کے چہرے کو ڈھال میں دیکھتا رہا۔ وُہ جُوں جُوں مدوسا کے سر کے نزدیک ہوتا گیا، اس کے سر کے سانپ پیچ و تاب کھانے لگے۔ ان کی زبانیں لمبی ہو کر باہر نِکل آئیں اور پھر مدوسا کے جسم میں حرکت ہوئی۔

لیکن پر سیَس کی تلوار کی حرکت مدوسا کے جسم کی حرکت سے تیز نِکلی۔ اُس نے بجلی کی سی تیزی سے مدوسا پر وار کیا اور اُس کا سر کٹ کر جسم سے علیحدہ ہو گیا۔

سِلوَر بولا۔ ”شاباش! اب جلدی کرو۔ کٹے ہُوئے سر کو فوراً تھیلی میں ڈال لو۔ “

پر سیَس کے گلے میں جادُو کی تھیلی لٹکی ہوئی تھی۔ جُوں ہی اُس نے تھیلی گردن سے اتُاری، وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ تھیلی بڑی ہو گئی ہے۔ اِتنی بڑی کہ یہ خوف ناک سر اُس میں آسانی سے سما سکتا تھا۔ اُس نے جلدی سے سر تھیلی میں ڈال دیا۔

ایتھنے کی آواز آئی ”تُمہارا کام ہو گیا۔ اب جلدی کرو۔ دُوسری چُڑیلیں جاگ گئی ہیں۔ “

دوسری چُڑیلوں نے مدوسا کی کٹی ہوئی گردن دیکھی تو وُہ چلّا اُٹھیں۔ بھیانک شور برپا ہو گیا۔ لیکن پر سیَس اُوپر اُڑ چُکا تھا۔

دونوں چُڑیلوں کے سروں کے سانپوں نے اور زیادہ زور و شور سے پھُنکارنا شرُوع کر دیا۔ مدوسا کے کٹے ہوئے سر پر جو سانپ تھے، وہ تھیلی کے اندر پھنکار رہے تھے۔



دونوں چُڑیلیں دانت نِکالے، پنجے پھیلائے، نہایت غُصّے میں چنگاڑتی ہوئی ہوا میں بُلند ہوئیں۔ اُنہوں نے اپنے ہیبت ناک پَروں کو زور زور سے ہلایا، جس سے ایک طوفان سا آگیا۔ وہ چاہتی تھیں کہ اُنہیں اُن کا دُشمن نظر آجائے تاکہ وہ اُسے پتھّر کا بنا دیں۔ لیکن پرسیَس نے تو سر پر جادُو کی ٹوپی پہنی ہوئی تھی۔ چُڑیلیں اُسے کیسے دیکھ سکتی تھیں۔ البتہ وہ چُڑیلوں کو دیکھ سکتا تھا۔ لیکن وہ بڑا ہوشیار تھا۔ وُہ جانتا تھا کہ اگر اُس نے چُڑیلوں کے چہرے پر نظر ڈالی تو وہ پتھّر کا بن جائے گا اور

یوں اُس کی کام یابی ناکامی میں بدل جائے گی۔

پَروں والے جُوتے اُس کے بڑے کام آئے۔ وہ ایک زبردست جھٹکے کے ساتھ اُوپر اُٹھا اور دیکھتے ہی دیکھتے چُڑیلوں سے میل بھر اُوپر چلا گیا۔ چُڑیلوں کی چیخ پُکار آہستہ آہستہ مدّھم ہوتی گئی۔ یہاں سے وہ سیدھا جزیرہ سیری فس کی طرف چل دیا تاکہ مدوساکا سر پولی دکتس کو پیش کر سکے۔

سیری فس پہنچ کر سب سے پہلے وہ اپنی ماں سے ملنے گیا۔ لیکن ظالم پری دکتس نے اُس کی ماں کو اِس قدر تنگ کیا تھا کہ وہ بے چاری گھر چھوڑ کر جا چُکی تھی۔ دراصل نیک دل مچھیرے نے اُس کو پولی دکتس کے عذاب سے بچانے کے لیے ایک مندر میں چھُپا دیا تھا، اور مندر کے پُجاری اُس کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ سوائے اِن چند لوگوں کے، اُس شہر کے سبھی لوگ بُرے تھے۔ بادشاہ اُن سب سے بُرا تھا۔ پرسیَس نے جب اپنی ماں کو گھر میں نہ پایا تو وُہ سیدھا پولی دکتس کے محل میں پہنچا۔ اُس کو بھلا یہ اُمّید کہاں تھی کہ پرسیَس چُڑیلوں سے یُوں بچ کر آ جائے گا۔ وُہ تو سمُجھے بیٹھا تھا کہ چُڑیلوں نے اُسے چیر پھاڑ دیا ہُو گا۔ پھر وُہ یہ سمجھا

کہ شاید پر سیَس راستے ہی سے واپس آ گیا ہے۔ اُسے چُڑیلوں ت ک پہنچنے کی ہمّت ہی نہیں ہُوئی۔

پھر بھی وُہ چہرے پر بناوَٹی مسکراہٹ لاتے ہُوئے بولا۔ ”کہو پر سیَس، مدوسا کا سر لے آئے؟ نہیں لے کر آئے تو تُمھیں سخت سزا دی جائے گی۔ کیوں کہ مُجھے یہ سر اپنی دُلہن کو تحفے میں دینا ہے۔“

پر سیَس بولا۔ ”عالی جاہ، میں آپ کے حکم کی تعمیل کیسے نہ کرتا۔ میں مدوسا چُڑیل کا سر لے آیا ہُوں۔ اُس کے سر کے پھُن کارتے ہُوئے سانپ بھی صحیح سلامت ہیں۔“

پولی دکتس بولا۔ ”کہاں ہے مدوسا کا سر۔ اگر تُم جھُوٹ نہیں بول رہے اَور اُس کے متعلّق سُنی سُنائی تمام کہانیاں سچ ہیں تو پھر تو یہ بڑا دِل چسپ نظّارہ ہُو گا۔“

”یقیناً، یقیناً۔ یہ بڑا ہی عجیب نظّارہ ہُو گا بل کہ عالی جاہ، میں درخواست کرتا ہُوں کہ حضُور اپنی رعایا کو بھی اِس نظّارے کا لُطف اُٹھانے کا موقع دیں اَور کل عام چھُٹّی کا اِعلان کر دیں۔ لوگوں نے چُڑیل کا سر نہ اِس سے پہلے کبھی دیکھا ہو گا نہ

آیندہ کبھی اُنہیں ایساموقع ملے گا۔ “

بادشاہ کو پتا تھا کہ اُس شہر کے لوگ کھیل تماشے پسند کرتے ہیں اور بات بات پر چھُٹّی کرنے کے موڈ میں ہوتے ہیں۔ اُس نے ڈھنڈورا پٹوا دیا کہ اگلے دن شہر میں چھُٹّی ہوگی اور لوگوں کو چُڑیل کا سر دِکھایا جائے گا۔

دُوسرے دِن لوگوں کا ایک بڑا ہجوم محل کی طرف دوڑا۔ یہ سب بُرے لوگ تھے۔ اچھے لوگ اپنے کام کاج میں مصرُوف رہے۔ یہ لوگ ایک دوسرے کو دھکّے دے کر اُس جگہ جانے کی کوشش کرتے، جہاں ایک بالکونی میں پرسیَس ایک تھیلے کے پاس کھڑا تھا۔

بالکونی کے پاس پولی دکتس کا تخت بِچھا تھا، جس پر وُہ بڑی شان سے بیٹھا تھا۔ اُس کے اِرد گرد وزیر اور دُوسرے درباری بیٹھے تھے اور نیچے لوگوں کا زبردوست ہجوم تھا۔ سب لوگوں کی نظر پرسیَس پر جمی ہوئی تھیں اور وہ ایک آواز ہو کر چلّا رہے تھے۔ ”ہمیں چُڑیل کا سر دکھاؤ!۔۔۔ جلدی کرو “!

پرسیَس اُداس ہو گیا۔ وہ بولا۔۔ ”بادشاہ سلامت اور لوگو! میں آپ کو یہ سر نہیں

دکھانا چاہتا۔ یہ اِتنی بُری چیز ہے کہ اِسے نہ ہی دیکھا جائے تو بہتر ہے۔ "

لوگ زور زور سے چیخے۔ "جھُوٹا۔۔۔ دھوکے باز۔۔۔ غدّار۔۔۔ یہ چُڑیل کا سر لے کر ہی نہیں آیا۔ ہمیں چُڑیل کا سر دکھاؤ، ورنہ تم تُمہارا سر قلم کر دیں گے۔"

وزیروں اور درباریوں نے آپس میں سرگوشی کی۔ بادشاہ نے اپنا ہاتھ اُوپر اُٹھایا اور پرسیَس کو حکم دیا۔ "چُڑیل کا سر فوراً دِکھاؤ، یا پھر مرنے کے لیے تیّار ہو جاؤ۔ "

"تو یہ لو۔۔۔" پرسیَس نے آنکھیں بند کر کے تھیلے میں سے سر باہر نکال لیا۔

سارے ہجوم پر خاموشی طاری ہو گئی۔ اور کیوں نہ ہوتی۔ چُڑیل کے کٹے ہوئے سر پر نظر ڈالتے ہی سب لوگ پتھّر کے بن گئے تھے۔

پرسیَس نے مدوسا کا سر واپس تھیلے میں ڈالا اور سیدھا اپنی ماں کے پاس مندر میں گیا۔ اُس نے ماں کو ساری کہانی سُنائی کہ کِس طرح وہ جان کی بازی لگا کر اس خطرناک مُہم پر گیا اور بُرے بادشاہ کا کیا انجام ہوا۔

جادُو کا ہاتھ

بُہت عرصہ ہوا کسی ملک پر ایک بادشاہ حکُومت کرتا تھا۔ اس کی ایک بیٹی تھی۔ بادشاہ کا نام مِداس اور شہزادی کا نام میری گولڈ تھا۔

مِداس کو سونے کی چیزوں سے پیار تھا اور اس کا خزانہ سونے کی بنی ہوئی چیزوں سے بھرا پڑا تھا۔ اُسے تو بادشاہت بھی اِسی لیے پسند تھی کہ اُسے سونے کا خُوب صُورت تاج سر پر رکھنے کا موقع ملتا تھا۔

سونے سے اُس کی محبّت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ اُس نے سونے کے کئی تاج بنوائے تھے۔ دربار کے لیے الگ، گھر کے لیے الگ۔

اُسے اپنی بیٹی میری گولڈ سے بُہت محبّت تھی اور وہ اُس کے لیے بھی بہت سا سونا اکٹھا کرنا چاہتا تھا۔

لیکن لالچ کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ یہ جب بڑھتا ہے تو بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ لالچ

میں آدمی اندھا ہو جاتا ہے اور اپنی خواہش پوری کرنے کے لیے عقل سے کام لینا بھی چھوڑ دیتا ہے۔

یہی حال بادشاہ مِدا اس کا ہوا۔ جب وہ سُورج کی سُنہری کِرنوں کو دیکھتا تو اُس کے دِل میں خواہش پیدا ہوتی کہ کاش! یہ سُنہری کرنیں جس چیز پر پڑیں اُسے سونے کا بنا دیں۔

جب کبھی میری گولڈ اپنے باپ کے لیے کوئی خُوب صُورت سا پھُول توڑ کے لاتی اور اُس کی تعریف کرتے ہُوئے اُس کو پیش کرتی تو وہ کہتا۔ ''اچھّا ہے۔ خُوب صُورت ہے۔ لیکن مزا تو جب آتا اگر یہ سونے کا ہوتا۔ اس کی پتّیاں سونے کی ہوتیں اور جن پودوں میں یہ کھِلتا ہے، وہ بھی سونے کے ہوتے۔''

معمُولی پھُولوں کی بات نہیں۔ گلاب کے پیارے پیارے خُوشبُو دار پھُول بھی بادشاہ کو صرف اِس لیے پسند نہ تھے کہ وہ سونے کے نہ تھے۔

بادشاہ کو اپنی جوانی میں گانے بجانے سے بُہت دِلچسپی تھی۔ وہ خود بھی اچھّا گاتا تھا اور اچھّے گویّوں کی بہت قدر کرتا تھا۔ لیکن اب اس کا یہ حال تھا کہ اُسے صرف

ایک ہی موسیقی پسند تھی اور وہ بھی سونے کے سِکّوں کی جھنکار۔ اُس کا سونے کا ذخیرہ ایک تہہ خانے میں تھا۔ اسے جب بھی فُرصت ملتی، تہہ خانے میں جا کر سونے کے سِکّے اور اشرفیاں گِنتا رہتا۔ اندر سے تالا لگا لیتا اور سونے کی تھیلیوں اور برتنوں وغیرہ کو دیکھ دیکھ کر خُوب خُوش ہوتا۔

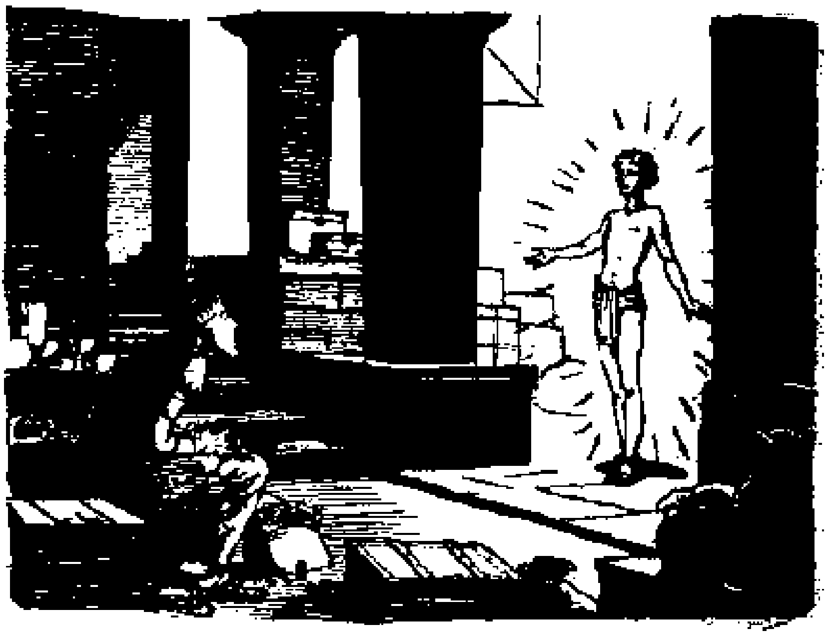
یہ اُس زمانے کی بات ہے جب عجیب عجیب باتیں ہوا کرتی تھیں۔ ایک دِن بادشاہ اپنے تہہ خانے میں بیٹھا سونے کی چیزوں کو دیکھ دیکھ کر دل بہلا رہا تھا کہ اچانک اُس نے دیکھا کہ کمرے میں سُورج کی روشنی پھیل گئی ہے۔

کمرا ہر طرف سے بند تھا۔ روشنی کا یہاں کبھی گُزر نہ ہوتا تھا، سوائے اُس چراغ کے جو بادشاہ روپے گننے کے لیے جلایا کرتا تھا۔ صرف اِتنا نہیں ہوا بلکہ اُس نے دیکھا کہ سُورج کی روشنی میں ایک شخص کھڑا مُسکرا رہا ہے۔ بادشاہ بُہت حیران ہوا کیوں کہ اُس نے تو اندر سے کُنڈی چڑھا رکھی تھی۔

بادشاہ مِداس لالچی ہونے کے باوجود عقل مند اور ذہین تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ کمرا تو بند تھا، پھر یہ شخص اندر کیسے داخل ہو گیا؟ یہ کوئی عام آدمی نہیں ہو سکتا۔ وہ یہ

سوچ ہی رہا تھا کہ اجنبی نے سونے کے ڈھیروں کو دیکھتے ہُوئے کہا :

”آپ تو بہُت امیر معلُوم ہوتے ہیں ؟ “



”بس اللہ کی مہربانی ہے۔ ویسے مُجھے یہ سونا جمع کرنے میں بڑا عرصہ لگا۔ اگر میری عمر ایک ہزار سال ہو جائے تو پھر میں واقعی امیر ہو سکتا ہُوں۔ “

اجنبی حیران ہو کر بولا۔ ”کیا؟ ۔۔۔۔۔ تو کیا تُم اب بھی مُطمئن نہیں ہو؟ اِتنی دولت سے بھی تُمہاری تسلّی نہیں ہوئی؟“ اب مِداس نے غور سے اجنبی کی طرف

دیکھا۔ اُسے یوں محسُوس ہُوا جیسے اُس اجنبی کو اللہ میاں نے کوئی خاص طاقت عطا کی ہے۔

وہ بولا۔ ”تھوڑی تھوڑی دولت جمع کرتے کرتے اُکتا گیا ہُوں۔ میں چاہتا ہوں کہ جس چیز کو ہاتھ لگاؤں، سونے کی بن جائے۔“

”اچھا! یہ بات ہے۔“ اجنبی بولا۔ ”گویا تُم ایسا جادُو کا ہاتھ چاہتے ہو کہ جِس چیز کو چاہو اُسے چھو کر سونا بنادو۔ سوچ لو۔ بعد میں پچھتاؤ گے تو نہیں؟“

بادشاہ بولا۔ ”آپ پچھتانے کی بات کرتے ہیں۔ یہ تو میرے لیے بُہت خُوشی کی بات ہو گی۔“

اجنبی نے جاتے ہوئے کہا۔ ”بہتر ہے۔ کل صُبح سُورج کی روشنی کے ساتھ ہی تُمھیں یہ طاقت مل جائے گی۔ تُم جِس چیز کو ہاتھ لگاؤ گے، یا تُمھارے جسم کا کوئی حصّہ اس سے چھُو جائے گا، وہ سونے کی بن جائے گی۔“

کمرا ایک دم روشن ہو گیا۔ بادشاہ نے اپنی آنکھیں بند کر لیں، اور جب دوبارہ

آنکھیں کھولیں تو کمرے میں اندھیرا چھایا ہُوا تھا۔ اجنبی جا چُکا تھا۔

اگلے دِن بادشاہ کی آنکھ صُبح ہی کھُل گئی۔ اُسے اُمّید تھی کہ وہ جس چیز کو ہاتھ لگائے گا، وہ سونا بن جائے گی۔ اس نے بستر کی چادر کو ہاتھ لگایا۔ لیکن وہ ویسی کی ویسی ہی رہی۔ وہ بہُت مایوس ہُوا اور کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

اچانک کھڑکی میں سے سورج کی روشنی اندر آئی اور چھت تک پھیل گئی۔ اُس کے اپنے چہرے پر بھی روشنی پڑ رہی تھی۔ بادشاہ یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ بستر کی چادر کپڑے کے بجائے سونے کی بن گئی ہے۔ سورج کی پہلی کِرن کے ساتھ ہی اُس میں چیزوں کو چھُو کر سونا بنا دینے کی طاقت آ گئی تھی۔

اس نے جیب سے عینک نِکال کر آنکھوں پر لگائی لیکن اُسے کچھ بھی دِکھائی نہ دیا، کیوں کہ عینک کو ہاتھ لگاتے ہی اُس کا فریم اور شیشے ٹھوس سونے کے بن گئے تھے۔

بادشاہ نے دِل میں ”سوچا کوئی بات نہیں۔ مُجھے پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ میری گولڈ مجھے پڑھ کر سُنا دیا کرے گی۔ پڑھنے کا کیا ہے۔ اب میں ہر چیز کو چھُو کر سونا

توبنا سکُوں گا۔ "

وہ بستر سے اُچھل کر اُٹھا تو اِس کے پیر پلنگ کے پائے پر لگے۔ پایہ سونے کا بن گیا۔ اس نے کھڑکی کا پردہ کھینچا تو وہ بھی سونے کا بن گیا۔ جوتے پہنے تو وہ بھی سونے کے بن گئے۔ اب وہ باغیچے میں گیا اور گُلاب کے رنگ برنگ پھُولوں کو دیکھنے لگا۔ اُس نے جس پھُول کو چھُوا، سونے کا بن گیا۔ اِتنے میں ناشتے کا وقت ہو گیا۔ وہ کھانے کے کمرے میں آ گیا۔

آج اُسے بہُت بھُوک لگی تھی۔ میز پر قسم قسم کے لذیذ کھاتے دیکھ کر اُس کی بھوک اور چمک گئی۔ اچانک میری گولڈ بھاگتی ہوئی اُس کے پاس آئی۔ اُس کے ہاتھ میں سنہرے رنگ کا گُلاب کا پھُول تھا۔ وہ روتے ہوئے بولی:

"ابّا جان، میں باغ میں پھُول توڑنے گئی لیکن وہ تو سب کے سب پتھّر کی طرح سخت ہو گئے ہیں۔"

بادشاہ بولا۔ "اس میں رونے کی کیا بات ہے۔ اب تو وہ پہلے سے بھی زیادہ خُوب صُورت ہو گئے ہیں۔ تم اِطمینان سے ناشتا کرو۔"

یہ کہہ کر بادشاہ نے چائے دانی اُٹھا کر پیالی میں چائے ڈالنی چاہی۔ لیکن چائے دانی سونے کی بن گئی اور پیالی میں جو چائے تھی، وہ بھی پگھلا ہُوا سونا تھا۔ سونا بھلا کیسے پیا جا سکتا ہے!

اُس کو پیاس لگی تھی۔ لیکن پانی کیسے پیتا؟ اس کو پریشان دیکھ کر میری گولڈ بولی:

"کیا بات ہے، ابّا جان؟" "کُچھ نہیں بیٹی۔۔۔۔" بادشاہ نے اپنی پریشانی چھُپاتے ہُوئے کہا۔ "تُم کھاؤ پیو۔۔۔"

اب مِداس نے سوچا کہ کُچھ پی تو سکتا نہیں، کھا کر ہی دیکھتا ہوں۔ لیکن انڈا، مکھّن، روٹی، مچھلی جو کُچھ بھی اُس نے کھانا چاہا اُس کے ہاتھ میں آتے ہی وہ سونا بن گیا۔

بادشاہ بہُت ہی گھبرایا اور دِل میں سوچنے لگا۔ "میں کیسے ناشتا کروں؟ جو کُچھ بھی کھانا چاہتا ہوں سونا بن جاتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ اِتنی قیمتی خوراک میرے سامنے پڑی ہے اور میں کھا نہیں سکتا۔"

اس کی نظر میری گولڈ پر پڑی جو ہنسی خُوشی کھانے میں مصرُوف تھی۔ لڑکی نے

سر اُوپر اُٹھایا تو محسُوس کیا کہ ابّا جان کو کوئی تکلیف ہے۔ وہ اُٹھ کر بادشاہ کے پاس آئی اور بولی:

"ابّا جان، خیریت تو ہے؟ آپ کُچھ پریشان نظر آ رہے ہیں۔" بادشاہ نیچے جھُکا اور بیٹی کی پیشان کو چُوما۔۔۔ لیکن یہ کیا۔۔۔؟

میری گولڈ کا پیارا اور خُوب صُورت چہرہ سونے کا بن گیا۔ اس کے پیارے پیارے بال سونے کے بن گئے۔ نرم اور نازُک جسم سُونے کی طرح ٹھوس ہو گیا۔ چمکتی ہوئی آنکھیں پتھرا گئیں اور وہ سُونے کا بُت بن کر رہ گئی۔

بادشاہ بُہت غمگین اور رنجیدہ ہو گیا۔ وہ اپنے آپ سے کہنے لگا۔ "یا اللہ! میں نے کیا کیا! کاش! میں دنیا کا سب سے غریب آدمی ہوتا، لیکن میری بیٹی زندہ رہتی۔ کاش! یہ دوبارہ زندہ ہو جائے۔"

پریشانی کے عالَم میں اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے کہ اتنے میں وہی کل والا اجنبی ظاہر ہُوا اور بولا :

”مداس، کیا حال ہے؟ اب تو خوش ہو نا؟ خُوب سونے میں کھیل رہے ہو۔۔۔
اب تو دولت کے ڈھیر لگ جائیں گے تُمہارے محل میں۔۔۔“

بادشاہ بولا ”کیا کروں گا اس سونے کو۔ کیا کروں گا اِس دولت کو۔ میری پیاری بچّی ہی مُجھ سے جُدا ہو گئی۔ میں کُچھ کھا نہیں سکتا، پی نہیں سکتا۔ سونے کے ڈھیروں میں کیسے زندہ رہ سکوں گا؟ مُجھے ایسا سونا نہیں چاہیے۔“

اجنبی بولا۔ ”تو گویا تُم نے اب کُچھ سبق سیکھ لیا۔ بتاؤ، سونا اچھّا یا پانی کا ایک گھونٹ؟ “

بادشاہ چلّایا۔ ”پانی سونے سے بہت قیمتی ہے۔“

اجنبی نے پُوچھا۔ ”روٹی کا ایک نوالا اچھّا ہے یا سونا؟“ بادشاہ چلّایا۔ ”دُنیا بھر کا سونا اکٹھا ہو جائے تو بھی وُہ روٹی کے ایک لُقمے کا مُقابلہ نہیں کر سکتا۔“

اجنبی پھر بولا۔ ”سونا اچھّا ہے یا بیٹی؟“

بادشاہ بولا۔ ”بیٹی۔ میری پیاری بیٹی۔ اگر مُجھے تمام دنیا کا سونا بھی مِل جائے تو میں

اُسے اپنی بیٹی کے ایک بال پر قُربان کر دُوں گا۔ "

اجنبی نے بادشاہ کی طرف دیکھتے ہُوئے کہا۔ "شُکر ہے۔ اب تُمہیں پتا چلا کہ وُہ معمولی چیزیں جو ہمارے روز مرّہ اِستعمال میں آتی ہیں، دولت کے ڈھیر سے زیادہ قیمتی ہیں۔ اب مجھے سوچ کر بتاؤ کہ چیزوں کو سونا بنانے کی طاقت رکھنا چاہتے ہو؟ "

بادشاہ چلّایا۔ "نہیں نہیں۔ ہر گز نہیں۔ مجھے سونا نہیں چاہیے۔ مُجھے سونے سے نفرت ہے۔"

اجنبی بولا۔ تو اس نہر میں جا کر نہاؤ جو تُمہارے باغ میں بہہ رہی ہے۔ پھر اُس میں سے کُچھ پانی لا کر اُن تمام چیزوں پر چھِڑکو جن کو واپس اصلی حالت میں لانا چاہتے ہو۔ اگر تُم نے یہ سب کُچھ سچّے دِل سے کیا تو، سونے کے لالچ میں اندھے ہو کر تُم نے جو نقصان اُٹھایا ہے وہ پُورا ہو جائے گا۔" بادشاہ فوراً نہر پر جا کر کپڑوں سمیت پانی میں کُود گیا اور دیر تک نہاتا رہا۔ جُوں جُوں وہ پانی میں ڈُبکیاں لگاتا، تُوں تُوں اپنے آپ کو پہلے سے ہلکا محسوس کرتا، جیسے کوئی بوجھ سر سے اُتر گیا ہو۔

نہر سے باہر نِکل کے اُس نے ایک پھُول کو چھُوا۔ اُس کی خوشی کی اِنتہا نہ رہی جب اُس نے دیکھا کہ پھُول پھُول ہی رہا۔ سونے کا نہیں بنا۔



وہ بھاگا بھاگا محل میں واپس آیا اور جگ لے کر پھر نہر کی طرف دوڑا۔ وہ جلدی سے پانی لا کر اپنی پیاری بیٹی پر چھڑکنا چاہتا تھا۔

جوں ہی اُس نے میری کے بُت پر پانی چھِڑکا،۔ اُس میں جان پڑنے لگی۔ میری گولڈ کا چہرہ پیلے کے بجائے گُلابی ہونا شروع ہو گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ اپنی اصل شکل میں آ گئی۔ کپڑوں سے پانی جھٹک کر اُس نے حیرت سے کہا۔ ”میرے کپڑے کیسے بھیگ گئے ؟ یہ تو بالکل خُشک تھے“!

میری گولڈ کر کُچھ پتا نہ تھا کہ اُس پر کیا بیتی تھی۔ نہ بادشاہ نے اُسے اپنے لالچ کے متعلّق کُچھ بتایا۔ وہ اُسے لے کر باغ میں نِکل گیا جہاں دونوں دیر تک تازہ پھُولوں کی خُوشبُو سُونگھتے رہے۔

پنڈوراکاپِٹارا

ہزاروں سال پہلے دُنیا آج سے بالکل مختلف تھی۔ یہاں صرف بچّے آباد تھے۔ ان بچّوں کی دیکھ بال کرنے کے اپنے ماں باپ کی ضرُورت نہ تھی، کیوں کہ اُس وقت دنیا میں ایسا کوئی خطرہ نہ تھا جس سے بچّوں کو بچایا جاتا۔ نہ کھانا تیّار کرنے کی ضرورت پڑتی، نہ کپڑے سینے کی۔ جب کسی بچّے کو بھُوک لگتی تو اُس کے مطلب کی چیز جھٹ آن موجُود ہوتی۔

بچّے ہر وقت کھیلتے اور خوشیاں مناتے۔ جو بات ہمیں آج بہت ہی عجیب نظر آتی ہے، وہ یہ تھی کہ اُس وقت بچّے آپس میں لڑتے نہ تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دنیا کی وہ بد صُورت مخلوق، جِس کا نام مُصیبت ہے، اس وقت کہیں نہ تھی۔ ہمارے زمانے میں تو مُصیبتیں مچھروں کی طرح اِدھر اُدھر اُڑتی پھرتی ہیں۔ لیکن اُس وقت اُن کا وُجود نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بچّوں کی دُنیا میں امن و امان

تھا۔

وہ بہت پیارا وقت تھا۔ بچّے ہر وقت ہنستے، قہقہے لگاتے، اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر بھاگتے پھرتے اور اُن کے دِن رات یُوں ہی خُوشی خُوشی گُزرتے۔

لیکن یہ اُس وقت کی بات ہے جب پنڈورا ابھی اپی تھِیَس کے ساتھ کھیلنے نہ آئی تھی۔

جب پہلے پہل پنڈورا اپی تھِیَس کے گھر آئی تو اُس کی نظر اپی تھِیَس کے گھر میں رکھے ہوئے ایک صندُوق پر پڑی۔ صندُوق فرش پر پڑا تھا۔ لیکن اپی تھِیَس کبھی اُس کے متعلق یہ نہ بتاتا کہ یہ کیا ہے، کہاں سے آیا ہے، اس کے اندر کیا ہے اور اسے کون یہاں لایا ہے؟

دن گُزرتے گئے۔ پنڈورا دُوسرے بچّوں کے ساتھ کھیلتی کُودتی رہی۔ لیکن اس کے دل سے اِس صندُوق کا خیال کبھی نہ نِکلا۔ وہ اپی تھِیَس سے بار بار پُوچھتی :

"اِسے کون لایا ہے، یہ کِس کا ہے اور اِس کے اندر کیا ہے؟"

اپی تھِیَس کہتا۔ ”پنڈورا زیادہ سوال مت کرو۔ یہ ایک راز ہے۔ یہ صندُوق میرے پاس صرف اِس لیے چھوڑا گیا ہے کہ میں اِس کی حفاظت کروں، اِس لیے نہیں کہ اِسے کھولوں۔ مجُھے نہیں معلُوم اس میں کیا ہے۔ “

لیکن اپی تھِیَس کی اِن باتوں سے پنڈورا کی تسلّی نہ ہوتی۔ اور وہ برابر صندوق کے بارے میں سوچتی رہتی۔ آخر وہ وقت بھی آیا کہ صندُوق کے خیال میں اُس نے کھیلنا کُودنا بھی بند کر دیا اور ہر وقت چُپ چُپ رہنے لگی۔

اس کے یُوں چُپ رہنے سے اپی تھِیَس نے ایک دِن اُس سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے، پنڈورا؟ تُم خاموش کیوں رہتی ہو “!

”تم اِس صندُوق کے متعلّق کُچھ بتاتے جو نہیں۔ “

اپی تھِیَس بولا۔ ”یہ صندُوق میرے پاس ایک مُسکراتا ہوا شخص چھوڑ گیا تھا۔ اُس کے سر پر پَروں والی ٹوپی تھی۔ وہ یہ بھی کہہ گیا تھا کہ اِسے حفاظت سے رکھنا اور کبھی کھُول کر نہ دیکھنا۔ “

پنڈورا بولی ”کیا اُس کے ہاتھ میں ڈنڈا بھی تھا؟ “

”ہاں۔ اُس کے ہاتھ میں ایک لمبا سا ڈنڈا تھا جِس پر دو سانپ ایسی صفائی سے بنائے گئے تھے کہ مُجھے تو اُن پر اصل سانپوں کا گُمان ہوتا تھا۔ “

پنڈورا بولی۔ ”پھر تو وُہ ضُرور کوئِک سِلوَر ہو گا۔ اِس قسم کا ڈنڈا تو اُسی کے پاس ہے۔ اور پھر وہی تو مُجھے یہاں تُمہارے پاس چھوڑ گیا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ میرے لیے کھلونے لایا ہو۔ میں کہتی ہُوں صندُوق کو کھُول کر تو دیکھو۔ “

”ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو۔ لیکن جب تک وہ واپس نہیں آتا، میں اُسے ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔ یہ اُس کی امانت ہے۔ تُم بھی اسے مت کھُولنا۔ یہ کہہ کر اپی تھِیَس کھیلنے کے لیے باہر نِکل گیا۔

پنڈورا نے کہا۔ ”کیسا بے وقوف لڑکا ہے یہ۔ اِسے اپنے آس پاس کی چیزوں سے کُچھ دِل چسپی نہیں۔ “ یہ کہہ کر وُہ صندُوق کو دیکھنے لگی اور دیر تک دیکھتی رہی۔

یہ عجیب صندُوق بڑی مضبُوط لکڑی کا بنا ہوا تھا اور اس پر ایسی اچھّی پالش کی گئی

تھی کہ پنڈورا کو اپنا چہرہ اس میں صاف نظر آتا تھا۔

اس کے اُوپر، دائیں، بائیں اور پیچھے خُوب صُورت بیل بُوٹے بنے ہوئے تھے، جِن کے پتّوں میں سے ننّھے مُنّے گول مٹول بچّے جھانکتے ہُوئے دِکھائے گئے تھے۔

صندُوق کا ڈھکنا سب سے زیادہ چمک رہا تھا، اور اُس کے درمیان میں ایک نہایت ہی خُوب صُورت چہرہ پنڈورا کی طرف دیکھ دیکھ کر مُسکرا رہا تھا، جیسے کہہ رہا ہو "تُم اِس صندُوق کو کھولتی کیوں نہیں؟ اس میں آخر ہرج ہی کیا ہے؟ کیا پتا اس میں کوئی پیاری سی چیز ہو؟"

پنڈورا نیچے کو جھُکی اور صندُوق کا ڈھکنا پکڑ کر اُوپر اُٹھانے لگی۔ لیکن ڈھکنا نہیں کھُلا۔ صندُوق سونے کی مضبُوط ڈوری سے بندھا ہوا تھا۔ پنڈورا نے دیکھا کہ ڈوری میں عجیب سی گانٹھ لگی ہوئی ہے۔ اُس نے گانٹھ کو غور سے دیکھا، لیکن اُس کا سِرا نظر نہ آتا تھا۔

پنڈورا اسی پریشانی میں تھی کہ اِس صندُوق میں کیا چھُپا ہے کہ اُسے باہر سے اپنے

ساتھیوں کے ہنسنے کھیلنے کی آواز آئی۔ دُھوپ نِکلی ہُوئی تھی۔ پیارا موسم تھا۔ اُس نے سوچا کہ اُسے کیا مُصیبت پڑی ہے کہ اس خواہ مخواہ کی پریشانی میں پڑے۔ کیوں نہ باہر جا کر ساتھیوں کے ساتھ کھیلے اور لُطف اُٹھائے۔

لیکن اس کی اُنگلیاں خود بخود سونے کی ڈوری کی طرف بڑھ گئیں اور اگلے ہی لمحے وہ گانٹھ کھولنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ صندُوق کے ڈھکنے پر جو پیارا سا چہرہ اُسے نظر آ رہا تھا، وہ اب مُسکرانے لگا تھا۔ اور اُس کی مُسکراہٹ بہُت ہی عجیب دِکھائی دے رہی تھی۔

پنڈورا نے تھوڑی سی کوشش کی۔ اُسے اُمّید تو نہ تھی لیکن سونے کی ڈوری کی گانٹھ واقعی کھُل گئی۔

گانٹھ کے کھُلتے ہی اُسے خیال آیا کہ اپی تھِیَس کو معلُوم ہو گیا کہ میں نے گانٹھ کھولی ہے تو وہ کیا سمجھے گا۔ کیوں نہ گانٹھ کو دوبارہ باندھ دُوں۔ لیکن اُسے تو یہ بھی یاد نہ رہا تھا کہ گانٹھ کھُلی کِس طریقے سے تھی۔ وہ کوشش بھی کرتی تو اُسے دوبارہ نہ باندھ سکتی تھی۔

اُس نے اپنے آپ سے کہا۔ ”جب اپی تھِیَس دیکھے گا کہ گانٹھ کھُلی ہوئی ہے تو وہ بھی یقین کرے گا کہ میں نے ڈھکنا اُٹھا کر اندر نہیں دیکھا۔“ وہ بڑی گھبرائی کہ اب کیا کرے!

عین اِس موقع پر پنڈورا کو صندُوق کے اندر سے ننّھی مُنّی آوازیں آنے لگیں۔ ”ہمیں باہر نِکالو، پنڈورا۔۔۔ ذرا دیکھو تو سہی، ہم تُمہاری کِتنی اچّھی سہیلیاں ہیں۔ ذرا ڈھکنا اُٹھاؤ۔ ہمیں باہر نکالو۔“

پنڈورا نے سوچا، کیوں نہ صندُوق کے اندر ذرا جھانک لُوں۔ اُس نے صندُوق کے ڈھکنے پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ اپی تھِیَس آ گیا۔ اگر وہ پنڈورا کو صندُوق کا ڈھکنا اُٹھانے سے منع نہ کر دیتا تو شاید آج تک کسی کو معلُوم نہ ہوتا کہ اس صندُوق میں کیا کُچھ بھرا ہوا تھا۔

اصل میں وہ خُود بھی یہی چاہتا تھا کہ اِس راز کا پتا چل جائے۔ وہ دروازے کے پاس رُک گیا اور خاموشی سے دیکھنے لگا۔

جُوں ہی پنڈورا نے ڈھکنا اُٹھایا، کمرے میں اندھیرا چھا گیا اور ایسی زور دار آواز

آئی جیسے بجلی کڑکی ہو۔

اب جو پنڈورا کی نظر صندُوق کے اندر پڑی تو کیا دیکھتی ہے کہ لاتعداد کیڑے اُڑ اُڑ کر کمرے سے باہر نِکل رہے ہیں۔

اپی تھِیَس درد کے مارے چیخ اُٹھا۔ "پنڈورا! یہ کیڑے مُجھے کاٹ رہے ہیں۔ تُم نے یہ کیا کِیا؟ صندُوق کیوں کھولا تُم نے؟"

یہ مچھروں مکھّیوں جیسے کیڑے بھنبھناتے ہُوئے کمرے کا چکّر لگائے لگے اور اپی تھِیَس اور پنڈورا دونوں کے کاٹنے لگے۔ پنڈورا بھی درد کے مارے چیخنے چلّانے لگی۔

صندُوق کا ڈھکن اُٹھا کر پینڈورا نے دنیا بھر کی مُصیبتوں کو آزاد کر دیا تھا۔ اِس صندوق میں دکھ، درد، بیماریاں اور تکلیفیں چھُپی ہوئی تھیں۔ اُنہیں اس لیے بند کیا گیا تھا کہ ہنستے مُسکراتے بچّے اِن دُکھوں، غموں، تکلیفوں اور بیماریوں سے دُور رہ سکیں اور اُن کی آرام سے گُزرتی ہوئی زندگی یُوں ہی خُوش و خُرّم گُزرتی رہے۔ اب تو پنڈورا مُصیبتوں کا پٹارا کھُول بیٹھی تھی۔

ان چھوٹی چھوٹی بلاؤں نے نہ صرف پنڈورا اور اپی تھِیَس کے کاٹا بلکہ کمرے سے باہر نِکل کر دُوسرے بچّوں کو بھی جا چمٹیں۔

مُصیبتوں کے اِس پٹارے کے کھُلنے سے دُنیا میں قہقہے اور مُسکراہٹیں ختم ہو گئیں۔ اِس کے علاوہ اب بچّے جوان اور جوان بُوڑھے ہونے لگے۔ یہی نہیں بلکہ اب پھُول بھی مُرجھا مُرجھا کر گِرنے لگے، حال آں کہ پہلے کبھی ایسا نہ ہوتا تھا۔

پنڈورا اور اپی تھِیَس کمرے کے اندر ہی رہے۔ ان کیڑوں کے کاٹنے سے اُن کے بدن میں سخت درد ہو رہا تھا۔ یہ پہلا درد تھا جو اُنھوں نے محسوس کیا تھا، ورنہ اب تک جب سے دُنیا بنی تھی، دکھ، تکلیف اور درد قسم کی کِسی چیز کا وَجُود نہ تھا۔ اُنھیں اِس بات کا اور بھی زیادہ دُکھ تھا کہ اُنھوں نے نہ صرف اپنے لیے بلکہ دُنیا کے دوسرے لوگوں کے لیے بھی تکلیفیں اور پریشانیاں پیدا کر دی ہیں۔

پنڈورا اس مُصیبتوں کے پٹارے پر سر ٹکائے فرش پر بیٹھی زار و قطار رو رہی تھی۔ اپی تھِیَس نے اُسے بار بار منع کیا تھا کہ اِس صنُدوق کو نہ کھولنا۔ لیکن اُس نے اس کی ایک نہ مانی۔ اس لیے وہ اس ساری مُصیبت کی ذمّہ دار اپنے آپ کو

سمجھ رہی تھی۔ اپی تھِیَس پینڈورا کی طرف پیٹھ کیے اُداس بیٹھا تھا۔ وہ بھی یہی سُوچ رہا تھا کہ کاش! وہ عَین وقت پر پنڈورا کو اِس حرکت سے روک دیتا۔ وہ بھی اپنے آپ کو برابر کا قصوروار سمجھ رہا تھا۔

اچانک صندُوق کے اندر سے کھٹ کھٹ کی آواز آئی۔ پنڈورا نے سر اُوپر اُٹھا کر کہا۔ ”یہ کیسی آواز ہے؟“

پھر ایسی آواز آئی جیسے کوئی نازک سی پری اپنی اُنگلی آہستہ آہستہ صندُوق کے ڈھکنے پر مار رہی ہو۔

پنڈورا کی طبیعت بے چین سی ہو گئی۔ وہ بول اُٹھی۔ ”کون ہو تُم؟“

صندُوق کے اندر سے ایک پیاری سی آواز آئی۔ ”ذرا ڈھکنا اُٹھا کر تو دیکھو۔ “

”نہیں نہیں۔۔۔“ پنڈورا روتے ہوئے بولی۔ ”اب میں یہ غلطی نہیں کروں گی۔ پہلے ہی بُہت پچھتا رہی ہُوں۔ “

وہ آواز پھر آئی۔ ”لیکن میں اِن خوف ناک مُصیبتوں جیسی نہیں ہُوں۔ میں اُن

سے بالکل الگ ہُوں۔ مُجھے باہر آنے دو۔ پنڈورا۔ تُم مُجھے باہر نِکال کر پچھتاؤ گی نہیں۔" پنڈورا نے اپی تھِیَس کی طرف دیکھتے ہُوئے پُوچھا۔ "کیا کروں؟ کھول دُوں صندُوق؟ اُٹھادُوں ڈھکنا؟"

اپی تھِیَس بولا۔ "پہلے ہی تُم بُہت سی مُصیبتیں دُنیا میں پھیلا چُکی ہو۔ اگر ایک اور نِکال دو گی تو کیا فرق پڑ جائے گا۔ جہاں ستیاناس وہاں سوا ستیاناس۔ "



وہی آواز پھر آئی۔ "بڑا چالاک لڑکا ہے۔ اندر سے تو دِل چاہتا ہے کہ مُجھے دیکھے،

لیکن باتیں سڑی ہوئی کر رہا ہے۔ آؤ پنڈورا، آؤ۔ ڈھکنا اُٹھاؤ۔ مُجھے باہر نِکالو اور دیکھو میں تُمھیں کیسا آرام پہنچاتی ہوں۔"

پنڈورا بولی۔ "چاہے کُچھ ہی ہو میں تو ضرور ڈھکنا اُٹھاؤں گی۔"

اِپی تھِیَس پاس آتے ہوئے بولا۔ "اور میں بھی تُمہارا ہاتھ بٹاؤں گا۔"

دونوں نے مل کر زور لگایا اور صندُوق کا ڈھکنا کھول دیا۔

ایک خُوب صُورت سی پری صندُوق سے باہر نِکلی اور مُسکراتی ہوئی پنڈورا کے پاس آئی۔ پھر جُوں ہی اُس نے پنڈورا کی پیشانی کو چُوما، اُس کا تمام درد ایک دم غائب ہو گیا۔ پھر وہ اُڑتی ہوئی اِپی تھِیَس کے پاس گئی تو اُس کا دُکھ درد بھی فوراً ختم ہو گیا۔ پنڈورا خُوش تھی کہ اِس بار اُس نے صندُوق کا ڈھکنا کھول کر غلطی نہیں کی۔

پینڈورا نے پُوچھا۔ "بتاؤ تو سہی، تُم کون ہو؟"

پری بولی۔ "میرا نام اُمّید ہے۔ مُجھے اِس پٹارے میں اِس لیے بند کیا گیا تھا کہ

ابھی ابھی جو تکلیفیں اور دُکھ تُم نے اِس صندُوق میں سے نکالی ہیں، میں دُنیا کے رہنے والوں کو اُن سے نجات دِلا سکُوں۔ "

اپی تھِیَس بولا۔ "کیا تُم ہمارے ساتھ ہمیشہ رہو گی؟ "

اُمِید نے مُسکراتے ہُوئے کہا۔ "جب تک تُمہیں میری ضرُورت رہے گی، میں تُمہارے پاس رہوں گی۔ اور وعدہ کرتی ہُوں کہ کبھی تُمہیں چھوڑ کر نہ جاؤں گی۔ بعض موقعے ایسے بھی آئیں گے جب تُم سمجھو گے کہ میں غائب ہو گئی ہوں۔ لیکن عین اس وقت جب تُم میرے آنے سے مایوس ہو چکے ہو گے، تُمہیں اچانک میری جگ مگ کرتی کِرن نظر آجایا کرے گی۔"

اُمّید نے سچ کہا تھا۔ اگرچہ مُصیبتیں، دکھ اور تکلیفیں دُنیا میں پھیلی رہیں اور لوگوں کو تنگ کرتی رہیں، لیکن اُمّید کی کِرن کبھی اُن سے دُور نہیں ہوئی۔

آج بھی جب ہم مایوس ہوتے ہیں تو اُمّید ہی ہماری ڈھارس بندھاتی ہے، اور مُصیبت کے ماروں کو نئی زندگی دیتی ہے۔ واقعی، اُمّید پر دنیا قائم ہے۔

اُڑنے والا گھوڑا

بُہت دِن ہوئے، ایک یُونانی نوجوان کہیں جا رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں گھوڑے کی لگام تھی۔ راستے میں ایک میدان پڑا تو وُہ وہاں کُچھ دیر سستانے کے لیے ٹھہر گیا۔

میدان میں ہری بھری گھاس اُگی ہوئی تھی۔ درمیان میں ایک چشمہ تھا جس میں سے پانی اُچھل اُچھل کر باہر گِر رہا تھا۔ ایسا معلُوم ہوتا تھا کہ یہاں جانور آ کر اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔

نوجوان نے اِردگِرد دیکھا۔ پھر پیٹ بھر کر ٹھنڈا پانی پیا۔ ایک لڑکی پاس ہی پانی کا گھڑا بھر رہی تھی۔ نوجوان نے اُس سے پوچھا۔ ”اس چشمے کا کیا نام ہے؟ “

لڑکی بولی۔ ”اسے پائرن کا چشمہ کہتے ہیں۔ سُنا ہے کہ دُور پہاڑوں پر ایک ایسی بُڑھیا رہتی ہے جِس کا جوان بیٹا مر گیا ہے۔ بُڑھیا کے آنسو آج تک نہیں رُکے اور

یہ اُسی کے آنسو ہیں جو پہاڑوں کے نیچے سے ہوتے ہوئے اِس چشمے میں سے نِکل رہے ہیں۔"

نوجوان بولا۔ "اچھا تو یہ ہے بائرن کا چشمہ۔ میں نے یہاں تک پُہنچنے کے لیے بُہت دُور دراز کا سفر کیا ہے۔"

پاس ہی ایک کسان اپنی گایوں کو پانی پلا رہا تھا۔ اُس نے نوجوان کی بات سُنی تو بولا۔ "تُمہارے ہاتھ میں لگام دیکھ کر مُجھے خیال آیا کہ شاید تُمہارا گھوڑا کھو گیا ہے۔"

نوجوان جِس کا نام بلفر تھا، بولا۔ "نہیں۔ یہ بات نہیں۔ میرا گھوڑا نہیں کھویا بلکہ میں تو اُس مشہُور دو پَروں والے گھوڑے کی تلاش میں مارامارا پھِر رہا ہُوں جِس کا نام پیگاسس ہے اَور جس کے متعلّق سُنا ہے کہ وُہ اِسی چشمے پر پانی پینے آتا ہے۔"

کسان نے ایک زور دار قہقہہ لگایا۔ "تو کیا تُمہیں یقین ہے کہ پَروں والے گھوڑے کی کہانی سچّی ہے؟ مُجھے حیرت ہے کہ اِس زمانے میں بھی لوگ اتنے وُہمی ہُو سکتے ہیں! ارے بھائی، اگر وُہ پَروں والا گھوڑا تُمہیں مل بھی گیا تو نہ تو وُہ

تُمہارے چھکڑے کو کھینچے گا اور نہ کھیتی باڑی میں تُمہاری کوئی مدد کر سکے گا۔ تُم فضول اس کے چکّر میں پڑے ہُوئے ہُو۔ "

پاس ہی ایک اُدھیڑ عمر کا آدمی کھڑا تھا۔ بلفر نے اُس سے پوچھا۔ "کیوں بھائی، کیا آپ نے کبھی اس گھوڑے کو یہاں دیکھا ہے؟ "

وُہ شخص بولا "جب میں جوان تھا تو اُن دنوں سُنا کرتا تھا کہ کوئی پَروں والا گھوڑا اس چشمے پر پانی پینے آتا ہے۔ دیکھا کبھی نہیں۔ خیالی بات معلُوم ہوتی ہے۔ "

اب بلفر نے یہی سوال اس لڑکی سے پوچھا جو گھڑے میں پانی بھر رہی تھی۔ وہ بولی میں نے کچھ عرصہ ہُوا کُچھ دیکھا ضرُور تھا۔ پتا نہیں وہ پیگاسس تھا یا کوئی بہت بڑا پرندہ آسمان میں اُڑ رہا تھا۔ اور ہاں، میں نے ایک بار یہاں چشمے کے پاس ایک گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز بھی سُنی تھی۔ لیکن خُدا جانے وہ پیگاسس تھا یا کوئی اور گھوڑا، کیوں کہ ہنہنانے کی آواز سُن کر جب میں نے اُدھر نظر دوڑائی تو کچھ نظر نہ آیا۔ "

ایک چھوٹا سا لڑکا اُن کی باتوں کو نہایت غور سے سُن رہا تھا۔ بلفر نے اُس سے کہا :

”کہو دوست، تُم نے تو پیگاسس کو یہاں اکثر دیکھا ہو گا۔ ہے نا؟“

”کیوں نہیں ۔۔۔“ لڑکا فوراً بولا۔ ”میں نے اُس پروں والے گھوڑے کو بیسیوں بار دیکھا ہے۔ ابھی کل ہی وہ یہاں پانی پینے آیا تھا۔“

بلفر نے لڑکے کی اُنگلی پکڑی اور اُسے ایک بار گھاس پر بٹھا کر بولا۔ ”تُم اس گھوڑے کے متعلّق جو کُچھ بھی مُجھے بتا سکتے ہو، بتاؤ۔ کیسا ہے؟ کب یہاں آتا ہے؟ کتنی دیر ٹھہرتا ہے؟“

لڑکا بولا ”میں اپنی کاغذ کی ناؤ روزانہ یہاں پانی میں چھوڑنے آتا ہوں۔ میری بہن بُہت اچھّی کشتی بناتی ہے۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ جب میں کشتی پانی میں چھوڑ رہا ہوتا ہُوں، مُجھے پانی میں پَروں والے گھوڑے کا سایہ دکھائی دیتا ہے اور آسمان میں بُہت بُلندی پر اُڑ رہا ہوتا ہے۔ پھر میرا دِل چاہتا ہے کہ یہ گھوڑا نیچے آئے اور مُجھے اپنی پیٹھ پر سوار کر کے دُور لے جائے، چاند اور ستاروں کی دُنیا میں۔ لیکن جب میں اُوپر آسمان پر نظر دوڑتا ہوں تو وہ غائب ہو چُکا ہوتا ہے۔ اکثر وہ یہاں اُتر کر پانی پیتا ہے۔ لیکن میرے آتے ہی اُڑ جاتا ہے۔“

بلفر نے لڑکے کی باتوں سے اندازہ لگا کر گھوڑا پیگاسس یہاں ضرُور آتا ہو گا۔ اُس نے اُسی میدان میں ڈیرا ڈال دیا۔ وہ دن رات وہیں رہتا۔ کبھی آسمان پر دیکھتا کہ شاید پیگاسس گھوڑا اُڑتا ہوا نظر آ جائے۔ کبھی پانی میں دیکھتا کہ شاید اس کا عکس ہی دِکھائی دے جائے۔ وہ لگام ہر وقت تیّار رکھتا۔ یہ لگام بُہت ہی خُوب صُورت تھی اور اس میں رنگ برنگ ہیرے جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ پاس کے گاؤں والے لوگ جب بھی پانی بھرنے کے لیے اُدھر آتے تو بلفر کا بڑا مذاق اُڑاتے۔ کہتے اس نوجوان کا دماغ چل گیا ہے۔ ان میں سے کئی نے اس سے کہا کہ وُہ اپنا گھوڑا اُس کے ہاتھ بیچنے کے لیے تیّار ہیں۔ چند لوگوں نے اُس سے اُس کی ہیروں والی لگام کا سودا بھی کرنا چاہا۔ لیکن بلفر کو تو دُھن ہی اور لگی ہُوئی تھی۔ وہ چشمے کے پاس ہی بیٹھا رہتا اور اِنتظار کرتا رہتا۔ اُسے یقین تھا کہ کبھی تو وہ گھوڑا اِدھر آئے گا۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ آخر بلفر کیوں اس پروں والے گھوڑے کو تلاش کر رہا تھا؟ بات اصل میں یہ تھی کہ بلفر کے ہمسایہ مُلک لائمیسیا میں ایک خوف ناک

بلا لوگوں کو تنگ کر رہی تھی، اور بلفر نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہاں کے لوگوں کو اس مُصیبت سے نجات دلا کر ہی دم لے گا۔ اور اس کام کے لیے اُڑنے والے گھوڑے سے بڑھ کر کوئی چیز اُس کی مدد نہیں کر سکتی تھی۔

اُن دِنوں کِسی نوجوان کی ہمّت اور بہادری جانچنے کا یہ طریقہ تھا کہ وہ جِنوں، چُڑیلوں اور خُوف ناک و حشی جانوروں سے لڑ کر کمزوروں کو اُن کے ظُلم سے بچائے۔

بلفر کے ہمسایہ مُلک لائیسیا کے بادشاہ نے بلفر سے مدد چاہی تھی کہ وہ اس چُڑیل سے وہاں کے باشندوں کو بچائے اور یہ بلفر کے لیے بڑے فخر کی بات تھی۔

اس چُڑیل کا نام کیمار یا تھا۔ یہ اس قدر بد صُورت، بھیانک اور تیز و طرار تھی کہ اُس سے لڑنا اور پھر بچ نکل جانا آسان کام نہ تھا۔ اُس کی شکل دیکھتے ہی جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا اور بڑے بڑے بہادروں کی ہمّت جواب دے جاتی تھی۔

اس کی دُم ایک بہت بڑے اژدھے جیسی تھی، اور اس کے تین سر تھے۔ ایک شیر کا، دوسرا بکری کا اور تیسرا ایک خطرناک قسم کے پھنیر سانپ کا۔ تینوں کے

مُنہ سے ہر وقت آگ کے شُعلے نکلتے رہتے تھے، جن سے دُور دُور تک کی چیزیں جل کر بھسم ہو جاتی تھیں۔

کیماریا چاہتی تو جنگلوں کو آگ لگا دیتی، کھڑی فصلوں کو جلا ڈالتی اور گاؤں کے گاؤں تباہ کر دیتی۔ وہ آدمیوں اور جانوروں کو زندہ نِگل جاتی اور اُنہیں اپنے پیٹ میں پکاتی جو ایک دھکتا ہوا تنور تھا۔ وہ شیر کی طرح دوڑتی اور سانپ کی طرح رینگتی تھی۔

ایسی ہیبت ناک چُڑیل کا مُقابلہ تو بہادُر سے بہادُر اِنسان بھی نہ کر سکتا تھا۔ لیکن بلفر نے پکّا اِرادہ کر لیا تھا کہ وُہ اس چُڑیل کو ٹھکانے لگا کر ہی دم لے گا۔ لیکن اس کے لیے اسے اُڑنے والے گھوڑے کی ضرورت تھی۔ لوگ کہتے تھے کہ اگر دنیا میں کیماریا جیسی خُوف ناک بلا ہو سکتی ہے تو اُسے ختم کرنے کے لیے پگاسس جیسی چیز بھی ضرُور ہو گی۔

یہی وجہ تھی کہ اس نے پیگاسس کی تلاش میں لائیسیا سے یُونان کا سفر اِختیار کیا تھا اور اپنے ساتھ جادُو کی لگام بھی لے کر آیا تھا۔ اُسے بتایا گیا تھا کہ اگر وہ یہ لگام

پیگاسس کے مُنہ میں ڈالنے میں کامیاب ہو گیا تو پھر اُسے مُشکل پیش نہ آئے گی اور وہ جہاں چاہے گا پیگاسس کو اُڑا لے جائے گا۔

وطن سے دُور اس چشمے کے پاس پیگاسس کا اِنتظار اِتنا کٹھن ہو گیا کہ کوئی اور ہوتا تو اس کی ہمّت جواب دے جاتی۔ لیکن بلفر نے حوصلہ نہ ہارا۔

ایک دن صُبح سویرے اُس کے پاس وہی لڑکا آیا جس نے اُسے پیگاسس کے بارے میں بتایا تھا۔ اس نے کہا "مُجھے یقین ہے کہ آج ہم ضرُور پیگاسس کو دیکھیں گے۔"

بلفر اور وُہ لڑکا تمام دِن اکٹھے بیٹھے پیگاسس کا اِنتظار کرتے رہے۔ اُنہوں نے وہیں کھانا کھایا اور پھر ایک درخت کے سائے میں بیٹھ کر پیگاسس کی راہ دیکھنے لگے۔ اچانک بلفر نے اپنے ہاتھ پر لڑکے کی اُنگلیوں کا دباؤ محسوس کیا۔ وہ کہہ رہا "بلفر! بلفر! وہ دیکھو، چشمے کے پاس۔ وُہ! وُہ!۔۔۔ اُدھر۔"

بلفر نے پانی میں دیکھا۔ اُسے بہت بڑے پَروں والے کِسی پرندے کا سایہ نظر آیا جو آسمان کی بُلندیوں میں اُڑ رہا تھا۔ اُس کے بڑے بڑے پَر دھوپ میں اِس طرح

چمک رہے تھے جیسے چاندی کے بنے ہوں۔

لڑکا بولا "یہ کوئی پرندہ نہیں ہے بلکہ پیگاسس گھوڑا ہے۔" یہ سُنتے ہی بلفر کے دِل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اُس نے لڑکے کو گود میں اُٹھایا اور ایک جھاڑی کی اوٹ میں ہو گیا، تاکہ پیگاسس اُنہیں دیکھ کر بھاگ نہ جائے۔

تھوڑی دیر بعد اُنہیں اپنے اوپر بڑے بڑے پَروں کی پھڑ پھڑاہٹ محسوس ہوئی۔ یہ واقعی پیگاسس گھوڑا تھا۔ نہایت سفید اور خُوب صُورت۔ آخر کار وہ چشمے پر پانی پینے آ ہی گیا تھا۔

پیگاسس کے پَر دھوپ میں چمک رہے تھے اور وُہ آہستہ آہستہ نیچے آ رہا تھا۔

نیچے اُتر کر اُس نے پانی پینا شروع کیا۔ معلُوم ہوتا تھا کہ اس کو چشمے کا پانی بُہت پسند ہے۔ وہ خُوب مزے لے لے کر پی رہا تھا۔

یہاں سے فارغ ہو کر وہ پودوں کے ایک جھُنڈ کے پاس گیا جن میں کاسنی رنگ کے خُوب صُورت پھُول لگے ہوئے تھے اور ہوا میں لہرا رہے تھے۔ وہ اُن

پھُولوں کو سُونگھنے لگا۔



اب وہ پھُولوں کو چھوڑ کر گھاس پر چلنے لگا اور پھر دوڑنے لگا۔ کبھی تھوڑا سا بُلند ہو کر اُڑنے لگتا، کبھی زمین پر آ کر کودنے اور بھاگنے لگتا۔

بلفر اور لڑکا اس نظّارے میں اس قدر کھو گئے کہ اُنہیں یہ خیال بھی نہ رہا کہ گھوڑا کہیں واپس نہ چلا جائے۔ لیکن گھوڑا تو کھیل کُود میں مشغول تھا۔ وہ بھاگتے بھاگتے گھاس پر اُلٹا لیٹ گیا اور جسم کو رگڑنے لگا۔ کبھی ایک پہلو بدلتا، کبھی دُوسرا۔

وہ اِتنا خُوب صُورت اور پیارا لگ رہا تھا کہ بلفر نے سوچا اس کے مُنہ میں لگام لگانا بڑی زیادتی ہو گی۔ لیکن پھر اُسے کیماریا کا خیال آ گیا۔ اس گھوڑے کے بغیر وہ اس چُڑیل کا مُقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

جب پیگاسس اچھّی طرح لوٹ پوٹ چُکا تو اُس نے سیدھا ہو کر اگلے دونوں پاؤں یُوں زمین پر رکھے جیسے اب اُٹھ کر کھڑا ہو جائے گا۔

بلفر اسی لمحے کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ جھاڑی کی اوٹ سے نِکل کر پوری رفتار سے بھاگا اور چھلانگ لگا کر پیگاسس کی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔ اُسے یقین نہ آ رہا تھا، لیکن واقعی وہ گھوڑے پر سوار ہو گیا تھا۔

پیگاسس کے لیے یہ ایک نئی بات تھی۔ اُس نے آج تک کب کسی انسان یا جانور کو اپنی پیٹھ پر سوار ہونے نہ دیا تھا۔ جوں ہی اُس نے اپنی پشت پر بوجھ محسُوس کیا، وہ ایک زبردست جھٹکے کے ساتھ فضا میں اُچھلا اور آنکھ جھپکنے میں زمین سے ہزاروں فُٹ اُوپر اُٹھ گیا۔

وہ غصّے سے جھٹکے کھا رہا تھا اور اس بوجھ کو جو اُس کی پُشت پر سوار ہو گیا تھا، اُتار

پھینکنا چاہتا تھا۔ اُس نے بلفر کر پٹخنے کے لیے ہر طریقہ آزمایا۔ لیکن بلفر کو یہ موقع کوئی روز روز تھوڑا ہی ہاتھ آتا تھا۔ وہ بھی اس کو چھوڑنے والا نہ تھا۔

اب پیگاسس نے ہوا میں پُورے زور سے قلابازی لگائی اور اپنا سر اگلی ٹانگوں میں پھنسا کر زور سے پیچھے کو دولتّی ماری۔ بلفر کا توازن بِگڑ گیا۔ قریب تھا کہ وہ زمین پر آرہتا کہ اس کا بایاں ہاتھ گھوڑے کی ایّال پر پڑ گیا۔ اُس نے ایّال مضبُوطی سے پکڑ لی۔

پیگاسس غصّے سے پاگل ہُوا جا رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے آگ برس رہی تھی اور مُنہ سے جھاگ نِکل رہے تھے۔

بلفر بڑا ہی ماہر گھُڑ سوار تھا۔ اُس نے موقع ملتے ہی پیگاسس کے مُنہ میں لگام ڈال دی۔ ایسا معلُوم ہُوا جیسے پیگاسس پر جادُو ہو گیا ہو۔ وہ یُوں خاموش ہو گیا جیسے بلفر کا پالتو گھوڑا ہو اور وہ سالہا سال سے اُس پر سواری کر رہا ہو۔

اِتنے وحشی اور بے قابو گھوڑے کے یوں خاموش ہو جانے پر بلفر کو کِسی قدر افسوس ہُوا۔ خود پیگاسس بھی کُچھ اُداس اور غمگین سا نظر آرہا تھا۔ اب اُس کی

ساری مستی جاتی رہی تھی اور جن آنکھوں سے وحشت اور شُعلے برس رہے تھے وہ بھیگی ہوئی تھیں۔

اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ یہ جو آدمی اُس کی پیٹھ پر سوار ہو گیا ہے، اس کے ساتھ کیا سلوک کرے گا !

پیگاسس کی اس اُلجھن کو بلفر فوراً سمجھ گیا۔ اس نے پیگاسس کی گردن پر پیار سے تھپکی دی اور بڑے مُلائم لفظوں میں اُسے آواز دی۔ اُس پر اُس کی آنکھوں میں دوبارہ چمک آگئی۔ اب وہ خوش تھا۔ ساری عُمر اکیلے گُزارنے کے بعد اُسے ایک اچھّا دوست مل گیا تھا۔

اس سے میں وہ سینکڑوں میل کا فاصلہ طے کر چُکے تھے۔ اب پیگاسس نے، ہیلکن نامی ایک پہاڑ کا رُخ کیا اور رفتار آہستہ کر کے اُس کی چوٹی پر اُتر گیا۔

بلفر نے اندازہ لگایا کہ یہی پیگاسس کا گھر ہو گا اور وہ یہیں رہتا ہو گا۔ وہ آہستہ سے اس کی پیٹھ پر سے اُتر گیا۔ وہ اُسے غلام بنانا نہیں چاہتا تھا۔ اُس نے اس کے مُنہ میں سے لگام نکالی اور کہا :

”پیگاسس، میرے دوست بن کر رہ سکتے ہو تو ٹھیک ہے، ورنہ تُم آزاد ہو۔ میری طرف سے تُم پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ “

بلفر کو ایسا معلُوم ہُوا جیسے گھوڑے نے اُس کی بات سمجھ لی ہو۔ اُس نے اپنے پَر پھیلائے اور پہاڑ کی چوٹی سے اُڑتا ہُوا سیدھا اُوپر اُٹھ گیا۔ شام کا شہر کا دُھندلکا پھیل رہا تھا۔ سُورج چھُپ رہا تھا۔ لیکن پیگاسس اتنا اُونچا اُڑا کہ سُورج کی روشنی اس کے پَروں کو چمکا رہی تھی۔

بلفر نے سمجھا کہ پیگاسس اب کبھی واپس نہ آئے گا۔ لیکن اُس کے چمکتے ہُوئے پَر آسمان پر پھر ظاہر ہوئے اور وہ واپس آ گیا۔ وہ بلفر کو اپنا دوست بنا چُکا تھا اور واپس اس کے پاس آ گیا تھا۔

اُس رات بلفر اور پیگاسس اکٹھے ہی سوئے۔ بلفر اس کی گردن میں بانہیں ڈال کر رات بھر سویا رہا۔ صُبح اُٹھ کر دونوں نے ایک دوسرے کو اپنی اپنی زبان میں سلام کیا اور کئی روز آسمانوں کی بُلندیوں میں اکٹھّے سیر سپاٹے کے لیے جاتے رہے تاکہ ایک دوسرے کو اچھّی طرح جان جائیں۔ ایک ہزار میل روزانہ کا سفر

پیگاسس کے لیے کوئی بات ہی نہ تھی۔ اس لیے اُنہوں نے مُلک مُلک کی سیر کی۔ کبھی تو پیگاسس بلفر کو اتنی اُونچائی پر لے جاتا کہ دُور سے زمین ننھّی مُنّی سی گیند نظر آتی۔

اُوپر ہمیشہ دھوپ ہی دھوپ ہوتی کیوں کہ وہ ہمیشہ بادلوں سے اُونچا اُڑتے۔ بلفر کو یہ سیر و تفریح اس قدر پسند تھی کہ شاید وہ ہمیشہ اسی میں مست رہتا۔ لیکن جب اُسے کیماریا کا خیال آتا تو وہ اپنا اِرادہ بدل دیتا۔ اپنا وہ وعدہ یاد آجاتا جو اُس نے لائیسیا کے بادشاہ سے کیا تھا کہ اُس کی رعایا کو کیماریا کے ظُلم و ستم سے نجات دلائے گا۔

آہستہ آہستہ بلفر کو آسمان کی بُلندیوں میں اُڑنے کی مشق ہو گئی اور پیگاسس اُس کے اشاروں کو خُوب سمجھنے لگا۔

ایک دن بلفر نے سوچا کہ اب وقت آگیا ہے کہ لائیسیا جا کر اُس خطرناک چُڑیل کا کام تمام کیا جائے۔

اُس رات وہ ہپّو نامی ایک چشمے کے کنارے سوئے اور صُبح سویرے ہی اُٹھ بیٹھے۔

نہائے دھوئے، چشمے کا تازہ پانی پیا۔ پھر پیگاسس کھڑا ہو گیا کہ بلفر اُس پر سوار ہو سکے۔ جب بلفر نے پیگاسس کے مُنہ میں لگام ڈال دی تو اُس نے اِدھر اُدھر اُچھل کُود شروع کر دی، جیسے اُڑنے کے لیے بے چین ہو رہا ہو۔

بلفر نے اسی دِن کے لیے گِن گِن کر گھڑیاں گُزاری تھیں۔ گھوڑے کو تیّار دیکھ کر اُس کا حوصلہ اور بھی بڑھ گیا۔ اُس نے کندھے پر ڈھال لٹکائی، ہاتھ میں تلوار لی اور لڑائی کے لیے تیّار ہو گیا۔

جوں ہی بلفر سوار ہوا، پیگاسس ایک جھٹکے کے ساتھ اُٹھا اور اگلے ہی لمحے وہ زمین سے پانچ میل اُوپر اُڑ رہا تھا۔ اِتنی اُونچائی سے راستہ زیارہ صاف نظر آ رہا تھا۔

بلفر نے پیگاسس کا رُخ مشرق کی طرف موڑا اور اب وہ لائیسیا کی پہاڑیوں اور وادیوں کے اُوپر اُڑ رہے تھے۔

اب بلفر نے گھوڑے کی رفتار آہستہ کر دی۔ خطرہ تھا کہ کیماریا کی نظر اُن پر پڑ گئی تو وہ پہلے ہی سے خبر دار ہو جائے گی اور مُمکن ہے اُس پر قابو پانا دُشوار ہو جائے۔

بلفر پیگاسس کو ایک بادل کی اوٹ میں لے گیا تاکہ اپنے آپ کو چھُپا کر کیماریا کے ٹھکانے کا پتا چلا سکے۔

نیچے زمین پر جلے ہُوئے مکانوں کے کھنڈر تھے اور کھیتوں میں دُور دُور تک اِنسانوں اور جانوروں کی ہڈّیاں بکھری ہوئی تھیں۔

بلفر نے اپنے آپ سے کہا "یہ ضرُور کیماریا کی کارستانی ہے۔ لیکن وہ ہے کہاں؟ وہ غار کہاں ہے جس میں سُنا ہے کہ وُہ رہتی ہے؟ اِتنی اُونچائی سے وہ نظر کیسے آئے گی؟ "

اُس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تر نزدیک ہی ایک جگہ سے دُھواں نِکلتا نظر آیا۔ اس نے پیگاسس کو اِشارہ کیا تو وہ ایک ہی جست میں نیچے آگیا اور زمین سے چند گز اُوپر اُڑنے لگا۔

اب بلفر کو ایک پہاڑی کے غار میں سے تین مُختلِف قسم کے دھُوئیں نکلتے نظر آئے۔

پیگاسس رفتار کم کر کے غار کے سامنے سے گُزرا تو بلفر نے اندر نگاہ دوڑائی۔ اُسے تین سروں والی چُڑیل نظر آ گئی۔ اُس کا ایک سر شیر کا، ایک بکری کا اور ایک پھنیر سانپ کا تھا۔ تینوں سروں کے مُنہ سے شُعلے نِکل رہے تھے جو تھوڑی دُور پہنچ کر دھُواں بن جاتے تھے۔

پیگاسس کی نظر بھی کیماریا پر پڑ گئی تھی۔ وہ بہت زور سے ہنہنایا۔ اُس کی آواز سُن کر چُڑیل کے تینوں سر اُوپر اُٹھے اور اس کے ساتھ ہی وہ چھلانگ لگا کر غار سے باہر نِکلی۔ اس نے اپنے بڑے بڑے پنجے اور تینوں سر اُوپر اُٹھائے ہُوئے تھے۔

اگر پیگاسس تیزی سے اُوپر نہ اُچھلتا تو چُڑیل اپنے تیز ناخنوں سے بلفر کی کھال اُدھیڑ ڈالتی۔ پیگاسس نے اُس کر بال بال بچا لیا تھا۔

بلفر نے تلوار ہلائی اور پیگاسس کے کان میں کہا :

”ہمّت کر کے ایک کوشش اور کرو، تاکہ میں اس چُڑیل کو قتل کر دوں۔ یاد رکھو! میں اِسے مارے بغیر یا خود مرے بغیر یہاں سے واپس نہیں جاؤں گا۔ تُمہیں اکیلے ہی واپس جانا ہو گا۔ “

پیگاسس نے سر موڑا اور اپنی ناک بلفر کے گال پر رگڑی۔ یہ اُس کا ہاں کہنے کا انداز تھا۔ بلفر شیر ہو گیا۔

اب پیگاسس تیر کی طرح نیچے آیا اور چُڑیل کے پہلُو کی طرف جھپٹا۔ اسی لمحے بلفر نے چُڑیل کے سر پر تلوار کا ایک بھرپور ہاتھ مارا۔



ذرا دُور جا کر بلفر نے واپس مُڑ کر دیکھا تو بکری والا سر کٹ چُکا تھا۔ شیر اور سانپ والا سر موجود تھا اور اُن کے مُنہ سے پہلے سے زیادہ آگ نکلنے لگی تھی۔

بلفر بولا۔ ”بہادر پیگاسس! بس ایک وار اور۔“ یہ سُنتے ہی پیگاسس پھر گولی کی طرح نیچے آیا۔ بلفر نے چُڑیل کے نزدیک پہنچ کر پوری قوّت سے تلوار کا بھرپور وار کیا۔ لیکن اِس دفعہ وُہ چُڑیل کے حملے سے نہ بچ سکے۔ کیماریا نے پنجہ مار کر پیگاسس کا بایاں کندھا زخمی کر دیا۔

بلفر نے مُڑ کر دیکھا کہ شیر والا سر بھی کٹ گیا ہے اور اب صرف سانپ والا سر رہ گیا ہے۔ لیکن اب اُس میں سے پہلے سے زیادہ شُعلے نِکل رہے تھے، اور اُن کی آواز اِتنی زیادہ تھی کہ پچاس میل کے فاصلے پر بیٹھے ہوئے لائسیا کے بادشاہ کو صاف سُنائی دے رہی تھی۔ وہ مارے خوف کے تھر تھر کانپ رہا تھا۔

گھوڑا ایک لمحے کے لیے ہوا میں رُک کر ہنہنایا تو بلفر نے کہا :

”ہمّت نہ ہارو میرے دوست۔ ابھی تو چُڑیل کا ایک سر باقی ہے۔“

یہ سُن کر گھوڑا پھر گولی کی طرح نیچے آیا۔ اِس بار بلفر نے عین چُڑیل کے سر کا رُخ کیا۔ اور ایک لمحے کے لیے تو یوں لگا جیسے بلفر اور پیگاسس دونوں سانپ کے مُنہ سے نکلے ہُوئے شُعلوں میں غائب ہو گئے ہوں۔

آگ کی گرمی نے پیگاسس کے پَر جھلس ڈالے۔ بلفر کے سر کے بال بھی جل گئے، حال آں کہ وہ ابھی چُڑیل سے سو گز دُور تھے۔

بلفر تیسرا اور آخری حملہ کرنا چاہتا ہی تھا کہ چُڑیل زور سے اُچھلی اور اپنی پوری قوّت سے پیگاسس سے چمٹ گئی۔ پھر اپنی سانپ والی دُم اس کے پیٹ کے گِرد لپیٹ کہ مروڑنے لگی۔

چُڑیل کے سانس سے بچنے کے لیے بلفر نے ڈھال آگے کر دی۔ گھوڑے نے جست لگائی اور پہاڑ کی چوٹی سے ہوتا ہُوا بادلوں سے بھی اُونچا چلا گیا۔ لیکن اب اُس پر صرف بلفر ہی سوار نہ تھا بلکہ کیماریا بھی لٹکی ہُوئی تھی اور وہ اُن دونوں کا بُوجھ اٹھائے ہوئے اُڑ رہا تھا۔

کیماریا کا غصّے کے مارے بُرا حال تھا۔ اُس نے نیچے سے بلفر پر حملہ کرنا چاہا لیکن ایسا کرتے ہوئے اُس کا سینہ بلفر کی تلوار کی زد میں آ گیا۔ بلفر نے پورے زور سے تلوار اُس کے سینے میں جھُونک دی۔ وہ دھڑام سے نیچے زمین پر گری اور گِرتے ہی جل کر راکھ ہو گئی۔

وہ لوگ جنہوں نے کیماریا کا جلتا ہُوا جسم نیچے گرتے دیکھا تھا، یہ سمجھے تھے کہ شاید کوئی ٹوٹا ہوا تارا گُزر رہا ہے۔ لیکن اگلے دِن اُنہوں نے عجیب نظّارہ دیکھا۔ کئی میل تک کھیت جل کر سیاہ ہو گئے تھے اور وہاں سفید ہڈّیوں کا ایک پہاڑ جیسا ڈھیر پڑا تھا۔ یہ تھا کیماریا کا انجام جو دُوسروں کو اپنی آگ میں جلاتی تھی، وہ خُود اُسی آگ میں جل کر راکھ ہو گئی تھی۔

اپنی اپنی فتح پر خوش ہو کر بلفر نے پیگاسس کی گردن پر تھپکی دی اور بولا "شاباش! شاباش! چلو اب واپس پائرن کے چشمے پر۔"

پلک جھپکتے میں وہ چشمے کے پاس تھے۔ چشمے کے تازہ پانی سے تازہ دم ہو کر بلفر نے سر اُوپر اُٹھایا تو اُس کے سامنے وہی بُوڑھا کھڑا تھا جس سے اُس نے پیگاسس کے بارے میں پوچھا تھا۔ بُوڑھا بولا:

"مجھے یاد آیا۔ میں نے اپنے بچپن میں اِس پَروں والے گھوڑے کو دیکھا تھا۔ لیکن اُس وقت تو اِس کے پَر بہت خُوب صُورت تھے۔"

اس بُوڑھے کو پتا نہ تھا کہ پیگاسس کے پَر اِس لیے بدنُما ہو گئے تھے کیوں کہ کیماریا

کے مُنہ سے نِکلے ہوئے شُعلوں نے اُنہیں جھُلس ڈالا تھا۔

اتنے میں کِسی کے قدموں کی آہٹ ہُوئی۔ بلفر نے مُڑ کر دیکھا۔ یہ وہی لڑکا تھا جس نے بلفر کو پیگاسس کے پَروں کا عکس پانی میں دِکھایا تھا۔ لڑکا بولا :

"تم جنگ جیت گئے ہو، بلفر۔ مُجھے پتا تھا کہ تم ضرُور جیتو گے۔"

بلفر بولا۔ "ہاں دوست۔ جنگ میں ضرُور جیت کر آیا ہوں، لیکن اگر تُم نے مُجھے حوصلہ نہ دلایا ہوتا تو میں زیادہ دِنوں پیگاسس کا اِنتظار نہ کرتا، اور نہ کبھی اس خُوف ناک چُڑیل کا مُقابلہ کرنے کے قابل ہوتا۔ یہ سب کُچھ تُمہاری وجہ سے ہوا ہے۔" یہ کہہ کر وُہ اُس جگہ گیا جہاں پیگاسس پانی پی رہا تھا۔ اُس نے اُس کے مُنہ سے لگام نِکالی اور کہا "تم اب واپس اپنے گھر جا سکتے ہو پیگاسس۔ جہاں چاہو اور جِس طرح چاہو رہو۔"

لیکن پیگاسس بلفر کو چھوڑ کر جانے کے لیے تیّار نہ تھا۔ اُس نے پیار سے اپنی تھوتھنی بلفر کے کاندھے پر رکھ دی۔

بلفر بولا۔ ”اچھّا، جیسی تُمہاری مرضی۔ جب تک جی چاہے میرے ساتھ رہو اور جب چاہو واپس چلے جانا۔ آؤ اب لائیسیا کے بادشاہ کے پاس چل کر اُسے بتاتے ہیں کہ ہم نے کیماریا کو کِس طرح ختم کیا۔

ہرکولیس اور بونے

(ہرکولیس قدیم یونان کا ایک ہیروجو بہت طاقتور اور بہادر تھا۔)

آج کل بھی دُنیا میں عجیب عجیب باتیں ہوتی ہیں۔ لیکن ہزاروں سال پہلے ان سے بھی زیادہ عجیب اور حیرت انگیز باتیں ہوتی تھیں۔

اُسی زمانے کی بات ہے کہ افریقہ کے جنگلوں میں ایک دیو رہتا تھا جس کا نام آنیتس تھا۔ اس کے پاس ہی چھوٹے چھوٹے لاکھوں بونے رہتے تھے۔

دیو اور بونے ایک ہی جگہ کے رہنے والے تھے، اس لیے وہ پیار محبّت سے رہتے تھے۔ اُنہیں اس مٹّی سے بھی بہت پیار تھا جہاں وہ پیدا ہوئے تھے اور وہ اس کے لیے ہر وقت جان قُربان کرنے کو تیّار رہتے تھے۔

دیو اِتنا بڑا تھا کہ آپ خیال بھی نہیں کر سکتے۔ اور بونے اِتنے چھوٹے تھے کہ دیو کا سر دیکھنے کے لیے اُنہیں دُوربین اِستعمال کرنی پڑتی تھی۔ اگر موسم دُھندلا ہوتا

تو اُنہیں دیو کے صرف پاؤں ہی نظر آتے۔ ہاں دُھوپ ہوتی تو بڑا مزہ رہتا۔ دیو اپنی بڑی سی آنکھ کھول کر دھوپ میں بیٹھ جاتا۔ اُس کی ایک ہی آنکھ تھی جو اُس کی پیشانی کے درمیان میں تھی۔ یہ آنکھ اتنی بڑی تھی جتنا تانگے کا پہیّا۔ وہ بونوں کی ساری قوم کو ایک ہی نظر میں دیکھ سکتا تھا۔

بونوں کے قد چھوٹے چھوٹے تھے۔ یہی کوئی چھ اِنچ کے قریب۔ اور اگر کِسی بونے کا قد سات یا آٹھ اِنچ کا ہوتا تو وہ اسے بُہت ہی لمبا خیال کرتے تھے۔

بونوں کے شہروں کی سڑکیں زیادہ سے زیادہ آدھ گز چوڑی تھیں، اور ان کا بڑے سے بڑا گھر طوطے کے پنجرے سے زیادہ بڑا نہ تھا۔

ان کا بڑے سے بڑا مینار چھ سات گز لمبا ہوا تھا اور کھیت ہمارے ہاں کی پھُولوں کی کیاری جتنے۔ بونوں کا ایک کُنبہ ہمارے جُوتے میں سما سکتا تھا اور ہماری جیب میں اُن جیسے کئی بونے چھُپائے جا سکتے تھے۔

دیو اِتنا لمبا تھا کہ کھُجور کے ایک درخت کو چھڑی کے طور پر اِستعمال کرتا تھا۔

بونے اِتنے چھوٹے تھے کہ جب فصلوں کی کٹائی کا وقت آتا تو دو بونے مل کر گیہوں کے ایک پودے کو کاٹتے اور کاٹنے کے فوراً بعد پُوری رفتار سے بھاگ اُٹھتے کہ کہیں پَودا اُن کے اُوپر نہ گر جائے۔

بونے دیو سے بہت محبّت کرتے تھے۔ وہ اپنا فالتو وقت اس کے ساتھ گُزارتے۔ کئی بونے اکٹھّے ہو کر دیو کے کان کے پاس آ کر زور سے پُکارتے ''کہو بھائی دیو، کیا حال چال ہے؟ اچھّے تو ہو؟ ''

جب وہ زور زور سے چیختے تب کہیں دیو کے کانوں میں آواز پہنچتی اور وہ کہتا :

''بونے بھائیو، آپ کا بہُت بہُت شُکریہ۔ بس آپ کی دُعا چاہیے۔ آپ تو اچھّے ہیں نا؟ ''

دیو کی آواز سے بونوں کے مکان ہل جاتے۔ اور وہ خُود مُشکل سے گرتے گرتے بچتے۔ یہ اُن کی خُوش قسمتی تھی کہ دیو اُن کا دوست تھا، ورنہ وہ چاہتا تو اپنے پاؤں کی ایک ٹھوکر سے اُن کا بڑے سے بڑا شہر تباہ کر دیتا اور پھُونک مار کر مکانوں کی دیواریں یُوں اُڑا دیتا جیسے بہُت بڑا طوفان آ گیا ہو۔

لیکن وہ ہم وطن تھے، اس لیے دیو بھی اُن سے بُہت محبّت کرتا، اُن کا بُہت خیال رکھتا اور اُنہیں ننھّی منّی مخلوق سمجھ کر اُن کے ساتھ بُہت اچھّی طرح پیش آتا۔ بونے بھی اُسے دِل کی گہرائیوں سے چاہتے تھے۔ اور کیوں نہ چاہتے۔ دیو اُن کے بُہت سے کام پلک جھپکتے میں کر دیتا تھا۔ جو کام وہ سینکڑوں ہزاروں مل کر بھی نہیں کرسکتے تھے، وہ اپنی ایک اُنگلی سے کر دیتا تھا۔

اگر ہوا بند ہوتی اور بونوں کو اپنی پن چکّیاں چلانے کے لیے ہوا کی ضرُورت ہوتی تو دیو پھُونک مار دیتا اور چکّیاں اِتنی تیزی سے چلتیں کہ رُکنے کا نام نہ لیتیں۔

جب سُورج پوری طرح چمک رہا ہوتا اور کسی طرف سایہ نہ ہوتا تو آنیتس ایک جگہ جم کر بیٹھ جاتا اور بونوں کی ساری آبادی اُس کے سائے میں لیٹ جاتی۔

لیکن وہ ان کے چھوٹے بڑے کسی مُعاملے میں دخل نہ دیتا تھا اور یہی بات بونوں کو سب سے زیادہ پسند تھی کہ وہ اپنے کام آزادی اور خُود مُختاری سے کرتے جس طرح چاہتے رہتے۔ جو چاہتے کرتے۔

وہ تماشا بڑا دِل چسپ ہوتا جب دیو سینکڑوں ہزاروں بونوں کے درمیان کھڑا

ہوتا۔ اس وقت وہ ایک بڑا سا مینار نظر آتا اور بونے اُس کی ٹانگوں میں کھیل رہے ہوتے۔ وہ یُوں نظر آتے جیسے چیونٹیاں رینگ رہی ہوں۔ اصل میں بات یہ تھی کہ صرف بونوں کو ہی دیو کی ضرُورت نہ تھی بلکہ دیو کو بھی کھیل تماشے کے لیے کُچھ کھلونے چاہییے تھے۔ وہ اکیلا تھا۔ اُس کا کوئی دوست نہ تھا۔ وہ بونوں سے دِل بہلاتا تھا۔

دُنیا میں اس جیسا دیو اور کوئی تھا ہی نہیں، اس لیے وہ کسی دیو کو دوست کیسے بناتا۔ جب وہ بالکل سیدھا کھڑا ہو جاتا تو اُس کا سر بادلوں کو چھُونے لگتا۔ اگر کوئی اور دیو اِتنا ہی بڑا ہوتا بھی تو آنتیں کی اُس سے لڑائی ہو جاتی۔

جب بونوں کی چھٹّی کا دِن ہوتا یا اُن کا کوئی تہوار یا قومی دِن ہوتا تو کھیلوں کے مُقابلے ہوتے۔ دوڑوں کے مُقابلے خاص طور پر دیو کے جسم پر ہوتے جو بونوں کے لیے بُہت لمبا چوڑا میدان تھا۔ جب وہ آرام کرنے کے لیے دھوپ میں لیٹتا تو اُس کا جسم بہت بڑا میدان معلوم ہوتا اور بونوں کو اُس کے سر سے پاؤں تک دوڑنے کے لیے کئی گھنٹے لگ جاتے۔

بونوں کے بچّے دیو کی داڑھی اور سر کے بالوں میں جھُولا ڈال لیتے۔ بعض لڑکے اس بات پر شرط لگا کر دوڑتے کہ کون سب سے پہلے دیو کی بڑی آنکھ کے گِرد چکّر لگاتا ہے۔

جب بھی دیو پہلو کے بل لیٹا ہوتا تو بڑا مزا آتا۔ اُس کا مُنہ تھوڑا سا کھُلا ہوتا تھا۔ بونے اُس کے اندر جھانکنے کے لیے اس کے پاس آتے، لیکن اُس کے نتھنوں سے نکلنے والی ہوا اُنہیں یُوں اُٹھا کر دُور پھینک دیتی جیسے آندھی میں کاغذ کے پرزے اُڑ جاتے ہیں۔

وہ پھر ہمّت کر کے اُس کے مُنہ کے اندر جھانکنے کے لیے آتے تو وہ مُنہ کھول کر جھُوٹ مُوٹ اُن کی طرف جھپٹتا، جیسے دو تین سو بونوں کو ایک ہی لُقمے میں کھا جائے گا۔ اپنے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ جاتے۔

پھر وہ اُس کی پیٹھ کی طرف چلے جاتے اور اپنے ننّھے مُنّے تیر اور چھوٹی چھوٹی تلواریں اُس کے بدن میں چھبوتے۔ لیکن دیو کو یُوں محسوس ہوتا جیسے مچھّر کاٹ رہے ہوں۔ وہ بچّوں کی شرارتوں کو ہنس کر ٹال دیتا اور کبھی ان سے خفا نہ ہوتا۔

وہ جانتا تھا کہ اگر اُس نے پہلو بدل لیا تو سینکڑوں بونے اس کے نیچے آ کر کُچل جائیں گے۔

ایک دن یُوں ہُوا کہ دیو دھوپ میں لیٹا آرام کر رہا تھا۔ کھجُور کا درخت، جو وہ چھڑی کے طور پر اِستعمال کرتا تھا، اُس کے پاس ہی پڑا تھا۔ اُس کے بونے دوست اُس کے پاس کھیل رہے تھے۔ دیو کا سر مُلک کے ایک حصّے میں تھا تو پیر دُوسرے حصّے میں۔ اُس کے خرّاٹوں کی آواز اتنی زبردست تھی جیسے بادل گرج رہے ہوں۔

ایک بونا جو دیو کے کندھے پر چڑھا ہوا تھا، اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ جب اُس کی نظر دُور اُفق پر پڑی تو اُسے ایک عجیب منظر دکھائی دیا۔ وہ ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔

پہلے تو اُسے یُوں نظر آیا جیسے ایک پہاڑ اُڑا چلا آ رہا ہو۔ لیکن زیادہ غور سے دیکھنے پر معلُوم ہوا کہ یہ تو ایک بُہت بڑا آدمی ہے۔ وہ اتنا بڑا تو نہ تھا جتنا دیو۔ پھر بھی پہاڑ کا پہاڑ معلُوم ہوتا تھا۔ یہ پہاڑ جیسا شخص آندھی طوفان کی طرح اُسی طرف آ رہا تھا جہاں دیو لیٹا ہُوا تھا۔



بونوں کے تو ہوش و حواس رُخصت ہو گئے۔ کُچھ دیر تو اُن کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کریں! آخر یہی مُناسب سمجھا کہ دیو کو جگائیں۔ پہلے وہ یہ سمجھے تھے کہ آنے والا دیو اُن کو تباہ کرنے آ رہا ہے۔ بعد میں اُنہیں خیال آیا کہ کہیں یہ آ نتیّس سے لڑنے نہ آیا ہو۔ یہ بات بھی اُنہیں منظور نہ تھی کہ اُن کے دوست دیو کو کوئی نقصان پہنے۔ کیوں کہ اُنہیں یہ یقین نہ تھا کہ اگر یہ آدمی جیت گیا تو وہ بھی اُن

کے ساتھ ایسا ہی عمدہ سلُوک کرے گا جیسا آ نتیَس کرتا تھا۔

وہ بونا جس نے سب سے پہلے آنے والے کو دیکھا تھا، آ نتیَس کے کندھے سے دوڑ لگا کر کان کی طرف آیا اور زور زور سے چلّایا :

"بھائی آ نتیَس، اُٹھو۔ جلدی کرو۔ ایک اور دیو آرہا ہے۔"

آ نتیَس نیند ہی میں بڑبڑایا۔ "بے وقوف! تُم دیکھ نہیں رہے کہ میں سو رہا ہوں؟ "

بونے نے پھر آنے والے کی طرف دیکھا۔ اب وہ پہاڑ کی طرح نہیں نظر آرہا تھا، بلکہ ایک بہت بڑا آدمی دِکھائی دیتا تھا۔ اس کی سُنہری ٹوپی اور ہتھیار دھوپ میں چمک رہے تھے۔ اُس کے پہلو میں تلوار لٹک رہی تھی اور پیٹھ پر شیر کی کھال۔ بغل میں ایک ڈنڈا تھا جو آ نتیَس کی شیشم کے درخت کی چھڑی سے بڑا تھا۔

بونوں کی ساری قوم نے اُس نئے عجوبے کو دیکھ لیا تھا۔ وہ لاکھوں کی تعداد میں اکٹھّے ہو کر چلّائے:

”آ نتیَس، آ نتیَس۔ جلدی اُٹھو۔ دیکھو، ایک آدمی تُمھارے ساتھ لڑنے آ رہا ہے۔ “

آ نتیَس نیند میں پھر بڑبڑایا۔ ”کیا بکواس کر رہے ہو۔ پہلے میں اپنی نیند پُوری کروں گا۔ پھر دیکھا جائے گا۔ “

اب اجنبی نزدیک پہنچ چُکا تھا اور بالکل صاف دکھائی دے رہا تھا۔ بونوں نے دیکھا کہ وہ آ نتیَس جتنا لمبا تو نہ تھا، لیکن اُس کا سینہ آ نتیَس سے زیادہ چوڑا تھا اور اس کے کندھے بہُت ہی خُوب صُورت لگ رہے تھے۔

بونے ایک بار پھر چلّائے۔ ”اُٹھو، اُٹھو۔ آ نتیَس۔ جلدی کرو۔ یہ آدمی تُم سے زیادہ طاقت ور معلُوم ہوتا ہے۔ اس کا سِینہ تُم سے زیادہ چوڑا ہے۔ “

اب آ نتیَس انگڑائی لے کر اُٹھا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ جُوں ہی اُس کی نظر اجنبی پر پڑی، وہ اُچھل کر کھڑا ہو گیا اور ایک قدم آگے بڑھا۔ پھر اُس نے اجنبی سے پُوچھا:

"تُم کون ہو اور یہاں کیا لینے آئے ہو؟"

یہ کہہ کر اُس نے کھجُور کے درخت کو گھُمایا۔ اِس سے ایسی آواز پیدا ہوئی جیسے آندھی چل رہی ہو۔

ایک بات میں نے آپ کو آنتیَس کے بارے میں نہیں بتائی۔ اصل میں یہ سب باتیں اس قدر عجیب اور حیرت انگیز ہیں کہ میں نے سمجھا آپ کو یقین نہ آئے گا۔ جب آنتیَس کے پیر زمین کو چھُوتے تو آنتیَس میں نئ طاقت آ جاتی تھی۔ زمین اُس کی ماں تھی اور وہ آنتیَس کا بُہت خیال رکھتی تھی۔

اگر کوئی عام آدمی ہوتا تو آنتیَس کا ڈنڈا دیکھتے ہی بھاگ اُٹھتا۔ لیکن اس اجنبی پر کُچھ اثر نہ ہُوا۔ وہ آنتیَس کو یُوں دیکھتا رہا جیسے اُس کی طاقت کا اندازہ لگا رہا ہو یا جیسے آنتیَس جیسے کئی دیووں سے لڑ چُکا ہو۔ آنتیَس گرج کر بولا۔ "تُم کون ہو؟ کیا نام ہے تُمہارا اور تُمھیں یہاں آنے کی کیسے جرأت ہُوئی؟"

اجنبی اُسے اُسی طرح گھُورتا رہا۔ پھر بڑے اطمینان سے بولا: "تُم بڑے ہی بد تمیز دیر ہو۔ میں تُمھیں تمیز سکھا کر ہی جاؤں گا۔ میرا نام ہرکولیس ہے۔ میں اپنے

بادشاہ کے لیے ہس پرید کے باغ سے سونے کے تین سیب توڑنے جا رہا تھا۔ اِدھر سے باغ نزدیک پڑتا ہے اِس لیے۔۔۔ "

آنتیَس اس کی بات کاٹ کر بولا۔ "باغ میں نہیں، تُم جہنّم میں جاؤ گے۔ ابھی میں تُمہارا بندوبست کرتا ہوں۔"

آنتیَس نے ہرکولیس کی طاقت کے متعلّق بہت سی کہانیاں سُن رکھی تھیں، اس لیے وہ اُس سے سخت نفرت کرتا تھا۔

ہرکولیس بولا۔ "تُم مُجھے آگے جانے سے نہیں رُوک سکتے۔" آنتیَس غصّے سے گرجا۔ "میں اس ڈنڈے سے تُمہارا بھُرکس نکال دوں گا۔ میں تُم سے پچاس گنا زیادہ طاقت ور تو ویسے ہی ہوں اور اب جب میں اپنا پاؤں زمین پر ماروں گا تو میری طاقت تُم سے پانچ سو گنا زیادہ ہو جائے گی۔ میں نہ صرف تُمہیں اپنا غُلام بنا کر رکھوں گا بلکہ تُمہیں میرے دوست بونوں کی بھی خدمت کرنی پڑے گی۔ اپنا ڈنڈا اور تلوار پھینک دو۔ اور یہ جو تُم نے شیر کی کھال پہن رکھی ہے، اس کے میں دستانے بناؤں گا۔ "

ہر کولیس بولا۔ ”بُہت خُوب! بہت ہی خوب! آؤ، ہمّت ہے تو یہ کھال میرے کاندھے سے اُتار کر تو دکھاؤ۔“

آنتیَس آگے بڑھا۔ ہر قدم پر اُس کی طاقت دس گنا بڑھ جاتی تھی۔ اُس نے کھجُور کا درخت پُورے زور سے گھُما کر ہر کولیس کے مارا، لیکن ہر کولیس نے یہ وار اپنے ڈنڈے پر روک لیا اور پھر انڈا اِتنے زور سے گھُما کر آنتیَس کے سر پر مارا کہ وہ زمین پر گِر گیا۔

بونے یہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ لیکن اُنہیں معلُوم تھا کہ اُنہیں زمین پر گِرا ہے تو دس گُنا زیادہ طاقت ور ہو کر اُٹھے گا۔

واقعی یہی ہُوا۔ آنتیَس زمین سے گرجتا ہُوا اُٹھا اور ہر کولیس پر حملہ کرنے کے لیے پھر ایک بار پورے زور سے درخت گھُمایا۔ ہر کولیس قد میں آنتیَس سے کُچھ چھوٹا تھا، اس لیے آنتیَس کا دوست اُوپر سے نیچے کو آ رہا تھا۔ لیکن ہو کولیس تیز بُہت تھا۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے درخت کے نشانے سے نِکل گیا۔ لیکن درخت میں بلا کا زور تھا۔ ہر کولیس تو بچ نِکلا مگر درخت پُورے زور سے زمین میں

گھُس گیا۔

اس سے پہلے کہ آ نتیَس درخت کو باہر نِکالتا، ہر کولیس نے اپنا ڈنڈا پُوری قوّت سے گھُما کر آ نتیَس کے کندھے پر اِتنے زور سے مارا کہ وہ بِلبلا اُٹھا۔ اس کے چیخنے کی آواز اتنی زبردست تھی کہ اس کی گونج تمام جنگل میں دُور دُور تک پھیل گئی۔

بونے پہلے ہی ڈر رہے تھے کہ بڑوں کی لڑائی میں کہیں وہ نہ کُچلے جائیں۔ جب آ نتیَس اور ہر کولیس کی لڑائی میں اُن کے مکان گرنے لگے تو وہ اور بھی خوف زدہ ہو گئے اور اُنہوں نے چلّانا شروع کر دیا۔

اس دوران میں آ نتیَس سنبھل چُکا تھا اور درخت کو زمین سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ ایک بار پھر درخت کو گھُماتے ہوئے بولا۔ "اب کے نہیں چھوڑوں گا۔ "

یہ کہہ کر اُس نے درخت گھُما کر مارا تو وہ ہر کولیس کے سر پڑنے کی بجائے اُس کے ڈنڈے پر پڑا۔ کھجُور کا درخت ریزہ ریزہ ہو کر بونوں کے گھروں پر ِگرا اور اُنہوں نے اِتنا شور مچایا کہ کان پڑی آواز سُنائی نہ دیتی تھی۔

ہرکولیس نے آنتیَس کو پہلو بھی بدلنے نہ دیا اور اپنے ڈنڈے سے اِتنی ضربیں لگائیں کہ وہ اوندھے مُنہ زمین پر گِرا۔ لیکن گِرتے ہی پھر اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کی بڑی سی آنکھ غصّے میں آگ کا انگارا بن چُکی تھی۔ اُس نے دونوں مکّے تان کر ہوا میں مارنے شروع کیے اور زور زور سے اُچھلنے لگا، جیسے صرف ہرکولیس ہی کو نہیں بلکہ تمام دنیا کو تہس نہس کر کے رکھ دے گا۔

اب ہرکولیس کو اندازہ ہو چکا تھا کہ یُوں تو آنتیَس کو عُمر بھر شکست نہ دی جائے گی۔ وہ ہر بار جب زمین سے اُٹھتا تو پہلے سے زیادہ طاقت ور ہو جاتا تھا۔

ہرکولیس نے اپنا ڈنڈا پھینک دیا اور آنتیَس سے کُشتی کے لیے تیّار ہو گیا۔ وُہ بہادروں کی طرح بولا :

"تُمہاری لاٹھی تو میں نے توڑ دی ہے۔ میرے لیے یہ مُناسب نہیں کہ ڈنڈا اِستعمال کروں۔ اب ہم کشتی لڑیں گے۔"

آنتیَس کو اپنی طاقت پر بڑا ناز تھا۔ وہ خوش ہو کر بولا:

”پھر تو تم گئے جہنّم میں۔ میں تُمہاری ہڈّی پسلی ایک کر دُوں گا۔ تُمہارا نشان بھی ڈھونڈنے سے نہ ملے گا۔“

یہ کہہ کر وہ غصّے میں بھر کر ہرکولیس پر جھپٹا۔ لیکن ہرکولیس نے اس کو پچھاڑنے کا منصوبہ بنالیا تھا۔ آنتیَس اس پر جھپٹنے کے لیے آگے بڑھا ہی تھا کہ اُس نے نیچے جھک کر اُس کی دونوں ٹانگیں کھینچ لیں اور کمر پکڑ کر اُسے دونوں ہاتھوں میں اُوپر اُٹھالیا۔

کیسا دل چسپ نظّارہ تھا! اتنا بڑا دیو ہرکولیس کے بازوؤں میں بے بس بیٹھا ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ اب وہ ہرکولیس کے رحم و کرم پر تھا۔ ہرکولیس چاہتا تو اُس کو اتنے زور سے زمین پر دے مارتا کہ اُس کا کچُومر نِکل جاتا لیکن وہ جانتا تھا کہ اگر آنتیَس نے زمین کو چھُو لیا تو اُس میں پھر طاقت آجائے گی اور مُقابلہ مُشکل ہو جائے گا۔

ہرکولیس کا اندازہ بالکل درست نکلا۔ جوں ہی آنتیَس کا جسم زمین سے اُوپر اُٹھا اُس کی طاقت جواب دینے لگی اور ہاتھ پاؤں کی حرکت کم ہوتے ہوتے بالکل ختم

ہو گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس کو زندہ رہنے کے لیے ہر پانچ منٹ کے بعد زمین سے طاقت حاصل کرنی ضروری تھی۔ اس کے بغیر وہ زندہ ہی نہ رہ سکتا تھا۔

جب ہرکولیس نے محسوس کیا کہ آنتئیس کی جان نِکل گئی ہے تو اُس نے ایک ہی جھٹکے میں اُس کی لاش ایک میل دُور پھینک دی، جہاں اُس کی ہڈّیاں آج تک پڑی ہیں۔

بونوں نے جب یہ نظّارہ دیکھا تو اُن میں سنسنی دوڑ گئی اور وہ چیخنے چلّانے لگے۔ لیکن اُن کی آواز اتنی مدّھم تھی کہ ہرکولیس سمجھا کہ پرندے چہچہا رہے ہیں۔

ہرکولیس بہت دُور دراز کا سفر کر کے آیا تھا۔ پھر اس نے آنتئیس سے لڑائی بھی لڑی تھی، اس لیے وہ بُہت تھک چکا تھا۔ اس نے شیر کی کھال زمین پر بچھائی اور سو گیا۔

بونوں نے دیکھا کہ ہرکولیس سو گیا ہے تو اُنہوں نے ایک بہت بڑا جلسہ کیا اور ایک بونا یُوں تقریر کرنے لگا:

”پیارے بھائیو! آپ نے دیکھا کہ ہم پر بُہت بڑی آفت آئی ہے۔ ہمارے دوست آنتئیس کو اس آدمی نے دھوکے سے مار دیا ہے اور اب یہ بدمعاش یُوں سویا ہُوا ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ ہمارے گھر تباہ ہو گئے۔ ہمارے شہر برباد ہو گئے۔ اور اس ساری تباہی کا ذمّے دار یہ شخص ہے جو آرام سے سو رہا ہے۔

”آنتئیس ہمارا بھائی تھا۔ اُسے اس زمین سے محبّت تھی۔ وہ ہمیں دھوپ سے بچاتا تھا۔ ہمارے بچّے اس کے ساتھ کھیلتے تھے۔ اس کے جسم پر کودتے تھے۔ اُس نے اُنھیں کبھی روکا، نہ نقصان پہنچایا۔ کیا ہم اُس کی موت کا بدلہ نہیں لیں گے؟ کیا ہم اپنے بھائی کے قاتل کو یُوں ہی آرام سے سونے دیں گے؟“

بونوں نے بڑے جوش سے تالیاں بجائیں۔ تقریر کرنے والے بونے نے اپنی تلوار (جو دو انچ لمبی تھی) نکال کر ہوا میں لہرائی اور کہا:

”ضرورت پڑی تو میں اکیلا ہی ہرکولیس سے لڑوں گا۔“

کافی بحث کے بعد فیصلہ ہوا کہ تمام بونے ایک ساتھ ہرکولیس پر حملہ کر دیں اور سوتے میں ہی اُس کا خاتمہ کر دیں۔

بعض جوشیلے بونوں نے کہا کہ اس قاتل کو جگا کر للکارا جائے اور جتا کر حملہ کیا جائے۔ لیکن جو زیادہ سیانے تھے اُن کی رائے تھی کہ سوتے میں ہی اُسے موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے۔

اسی وقت بیس ہزار بونے کیل کانٹے سے لیس کیے گئے۔ دس ہزار بونوں کو حکم دیا گیا کہ وہ گھاس پھُونس کے گٹھّے اُٹھا کر ہرکولیس کے جسم پر چڑھ جائیں اور اس کی ناک اور مُنہ بند کر دیں تا کہ اس کا سانس رُک جائے۔ لیکن یہ سکیم کامیاب نہ ہو سکی۔ کیوں کہ بونوں کی جو بھی ٹولی ہرکولیس کے مُنہ اور نتھنوں کے پاس پہنچتی وہ اس کی ناک میں سے نکلنے والی ہوا کے زور سے اُڑ کر بہُت دُور جا گرتی۔

جب یہ سکیم کامیاب نہ ہوئی تو بونوں کے لیڈروں نے مشورہ کیا۔ آخر فیصلہ یہ ہوا کہ ہرکولیس کے سر کے اِرد گرد خُشک لکڑیوں اور گھاس پھُونس کا ڈھیر لگا دیا جائے۔ جب یہ کام ہو گیا تو تیر اندازوں کو حکم دیا گیا کہ اگر ہرکولیس ذرا بھی حرکت کرے تو وہ اس پر تیروں کی بوچھاڑ کر دیں۔

یہ سب تیّاریاں کر کے اُنھوں نے لکڑیوں اور خُشک گھاس کے ڈھیر کو آگ لگا دی

جو دیکھتے ہی دیکھتے اُوپر تک پھیل گئی۔ آگ لگانا تو ایک بونے کے لیے بھی اِتنا ہی آسان ہے جتنا ایک بڑے آدمی کے لیے۔ لیکن اس کا فائدہ تو جب ہوتا اگر وہ ہرکولیس کو کسی طرح ہلنے نہ دیتے۔

جُوں ہی ہرکولیس کو آگ کی گرمی محسوس ہوئی، وہ فوراً اُٹھ بیٹھا۔ اُس کا خیال تھا کہ اب کوئی اور دیو آگیا ہے۔ جب اُسے آس پاس کُچھ دکھائی نہ دیا تو وہ حیران سا ہو کر بولا۔ "یہ کیا ہے؟"

عین اُسی وقت بیس ہزار تیر اندازوں نے اُس کے چہرے کا نشانہ لے کر تیر چھوڑ دیے۔

لیکن اُن کے تیروں کے مُقابلے میں ہرکولیس کی جِلد بُہت سخت تھی۔ کوئی بھی تیر اُس کے چہرے میں نہ چُبھ سکا۔ بونے چلّا چلّا کر کہہ رہے تھے۔

"بدمعاش، تُو نے ہمارے دوست اور مُحسن آنتیَس کو مار دیا ہے۔ اب ہم تُجھے مار کر ہی دم لیں گے۔"

ان کی آوازیں بڑی مُشکل سے ہرکولیس کے کانوں تک پہنچیں۔ لیکن اُسے کُچھ نظر نہ آیا۔ آخر جب اُس نے اپنے پیروں کی طرف نظر دوڑائی تو اُسے بونوں کا ایک بڑا ہجُوم دکھائی دیا۔ وہ نیچے جھکا اور جو بونا سب سے نزدیک تھا، اُسے اُٹھا کر ہتھیلی پر کھڑا کر لیا۔ یہ وہی بونا تھا جو بڑے جوش و خروش سے تقریر کر رہا تھا۔

ہرکولیس حیران ہو کر بولا۔ "کیا چیز ہو تُم؟"

بونا بولا "میں تُمہارا دُشمن ہُوں۔ تُم نے ہمارۓ دوست آنتیَس کر مار ڈالا ہے۔ ہم نے تہیّہ کر لیا ہے کہ تُمہیں مار کے دم لیں گے۔ میں اکیلا تُم سے لڑوں گا۔"

ہرکولیس پہلے تو بڑا حیران ہوا، پھر اُسے ہنسی آ گئی۔ اس قدر ہنسی آئی کہ بونا اُس کی ہتھیلی پر سے گِرتے گِرتے بچا۔

ہرکولیس بولا۔ "میں نے اپنی زندگی میں بڑے بڑے عجوبے دیکھے ہیں۔ چھ ٹانگوں والے آدمی، نَو سروں والے آدمی، تین سَروں والے کُتّے، ایسے جن کے پیٹ میں تنُور جلتے تھے۔ اور اس طرح کی اور بہُت سی چیزیں۔ لیکن تُم سب سے عجیب مخلُوق ہو۔ تُمہارا جسم میری چھوٹی اُنگلی سے بھی چھوٹا ہے۔ یہ تو بتاؤ تُمہارا

حوصلہ کتنا ہے؟"

بونا بولا۔ "اتنا ہی جتنا تُمہارا۔"



بونے کے اس جواب پر ہوکولیس بہت خُوش ہوا۔ اس کے دل میں بونوں کے لیے عزّت پیدا ہو گئی۔ اُس نے اس بونے کو، جسے وہ اپنی ہتھیلی پر اُٹھائے ہُوئے تھا ہولے سے زمین پر رکھ دیا اور بولا :

”میرے ننّھے دوستو، میں تُم سے ہر گز نہیں لڑوں گا۔ تُمہارے چھوٹے چھوٹے جسموں میں اتنے بڑے بڑے دِل ہیں کہ میں سوچتا ہوں اتنے بڑے دِل اتنے چھوٹے جسموں میں سما کیسے سکتے ہیں؟ میں نے جو کچھ کیا ہے، اس کے لیے میں معافی چاہتا ہوں۔“

یہ کہہ کر ہرکولیس نے اپنا ڈنڈا اُٹھایا اور ہنستا ہوا بولا۔ ”مُجھے زندگی میں پہلی بار شکست ہوئی ہے۔ “

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہرکولیس شیر کی کھال میں بونوں کی ساری قوم کو لپیٹ کر لے گیا اور اپنے بادشاہ کو تحفہ پیش کیا۔ لیکن یہ بات دُرست معلُوم نہیں ہوتی، کیوں کہ بونے اپنے علاقے میں اب بھی موجود ہیں۔

بونوں کے بچّے اپنے سکولوں میں تاریخ کی جو کتابیں پڑھتے ہیں اُن میں لکھا ہوا ہے کہ کِس طرح اُن کے بہادر باپ دادا نے ہرکولیس سے آنتیَس کی موت کا بدلہ لیا اور کس طرح اس کو نیچا دکھایا۔

یُولی سس اور جادُوگرنی

اِتھاکا کا بادشاہ یُولی سس بُہت بہادُر اور عقل مند تھا۔ وُہ ایک لڑائی جیت کر اپنے مُلک واپس آ رہا تھا کہ راستہ بھُول گیا۔ سمندر کے طوفان میں اُس کے جہازوں کا بیڑا بکھر گیا۔ بُہت سے جہاز ٹوٹ پھوٹ گئے، بہت تباہی ہوئی اور اُس کے سینکڑوں ساتھی مارے گئے۔

وطن واپس پہنچتے پہنچتے یُولی سس کو دس سال کا عرصہ لگ گیا اور ان دس سالوں میں اُس نے بہت سی عجیب و غریب چیز دیکھیں۔ قسم قسم کے لوگ، بھانت بھانت کی بولیاں اور مُلک۔ یہ سب کُچھ اس لیے ہوا کہ وہ سمندر میں اپنا راستہ بھول گیا تھا۔

اب صرف یُولی سس کا اپنا جہاز باقی رہ گیا تھا جس پر وہ اور اُس کے تیس ساتھی سوار تھے۔ جب اُس کا جہاز اِن تمام خطرناک مہموں سے بچ نِکلا تو ایک دن خود

بخود ایک گُم نام جزیرے کے ساحل سے جا لگا۔

یُولی سس نے اپنے بیس ساتھیوں سے کہا کہ وہ جزیرے میں جائیں اور کھانے پینے کی چیزیں تلاش کریں، اور کوئی ایسی محفوظ جگہ بھی دیکھیں جو رہائش کے کام آ سکے۔ دراصل یہ لوگ بہُت تھک چکے تھے اور یُولی سس چاہتا تھا کہ اِس سے پہلے کہ وہ وہاں سے روانہ ہوں، مکمّل آرام کر لیں۔

لیکن وہ لوگ جزیرے میں ایسے غائب ہُوئے کہ واپس ہی نہ آئے۔ ایک دن، دو دِن، تین دِن، پورا ہفتہ گُزر گیا۔ یُولی سس اور اُس کے باقی ساتھی بڑے پریشان ہوئے کہ اب کیا کریں؟

آخر کار یُولی سس نے فیصلہ کیا کہ وُہ خُود جا کر اُن کو تلاش کرے گا۔ لیکن اس کے ساتھی بولے:

”آپ نہ جایئے۔ آپ ہمارے بادشاہ ہیں۔ ہم آپ کے بغیر اِتھاکا کیسے جائیں گے۔ خُدا نہ کرے آپ کو کُچھ ہو گیا تو آپ کی عقل اور ہمّت کے بغیر ہم کِسی کام نہ رہیں گے۔“

یُولی سس بولا ”اگر میں تُمہارا بادشاہ ہوں، اور اِتنا ہی عقل مند ہوں جتنا تُم سمجھتے ہو تو پھر یہ میرا فرض ہے کہ میں جاؤں اور اپنے بہادُر ساتھیوں کو تلاش کروں۔ اُنھوں نے ہر دُکھ درد میں میرا ساتھ دیا۔ جنگوں اور خطرناک مُہمّوں میں میرے ساتھ رہے۔ اب میں اُنہیں کیسے چھوڑ دوں۔ میں یا تو اُنہیں لے کر آؤں گا یا اپنی جان بھی دے دوں گا۔ “

یہ کہہ کر اُس نے اپنی تلوار اور نیزہ لیا اور جھاڑیوں کی طرف چلتا ہُوا نظروں سے او جھل ہو گیا۔

وہ تھوڑی ہی دُور گیا ہو گا کہ اُسے لمبے کوٹ اور پروں والی ٹوپی والا ایک آدمی نظر آیا۔ وہ اِتنے ہلکے ہلکے قدم اُٹھا رہا تھا جیسے اُس کے پیروں میں پَر لگے ہوں۔ اس کے ہاتھ میں ایک ڈنڈا تھا جس پر بل کھاتے ہوئے سانپ بنے ہُوئے تھے۔

آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ کون تھا۔ یہ کوئِک سِلوَر تھا جسے یُولی سس اچھی طرح جانتا تھا۔ بلکہ اُس نے اتنی چالاکی اور ہوشیاری سِلوَر ہی سے سیکھی تھی۔

سِلوَر نے یُولی سس سے پُوچھا۔ ”خیر تو ہے؟ یہ ہوا کے گھوڑے پر سوار کِدھر جا

رہے ہو؟ تُمھیں معلُوم نہیں کہ یہ جادُو نگری ہے اور یہاں کی ملکہ ایک جادُوگرنی ہے جس کا نام 'سرس' ہے۔ وہ جو سامنے درختوں کا جھُنڈ نظر آرہا ہے، وہاں سرس کا سنگِ مرمر کا محل ہے۔ اُس کے جادُو سے ذرا بچ کر رہنا۔ وہ جسے چاہے جادُو کے زور سے پرندہ یا چوپایہ بنا دیتی ہے۔" یُولی سس بولا۔ "اچھّا! کیا واقعی؟ مُجھے تو بالکل معلُوم نہیں تھا۔ اچھّا کیا جو تُم نے بتا دیا۔ اور ہاں، ابھی جب میں اِس طرف آرہا تھا تو میں نے ایک بُہت ہی خُوب صُورت پرندہ دیکھا تھا۔ ایسا معلُوم ہوتا تھا کہ وہ مُجھے بُلا رہا ہے۔ کیا وُہ کوئی اِنسان تھا؟ "

سِلوَر بولا۔ "ہاں۔ وُہ ایک مُلک کا بادشاہ تھا، اور اُس کا نام پائیکس ہے۔ وہ اپنے شاہی لباس، تاج اور سونے کے ہار پر بڑا فخر کرتا تھا، اس لیے سرس نے اُسے پرندہ بنا دیا۔"

یُولی سس نے کہا۔ "اسی لیے وہ بُہت اُداس سا تھا۔ "

سِلوَر بولا "جب تُم سرس کے محل کے قریب پہنچو گے تو کئی بھیڑیے، شیر اور چیتے تُمھارے پاس آئیں گے۔ پہلے وہ اِنسان تھے۔ سرس نے اِن سب کو جادُو

کے زور سے ویسے ہی جانور بنا دیا جیسی اُن کی شکلیں تھیں۔ سرس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ کسی آدمی کی شکل جس جانور یا پرندے سے ملتی جُلتی دیکھتی ہے، اُسے ویسا ہی جانور یا پرندہ بنا دیتی ہے۔"

یہ سُنتے ہی یُولی سس بے چین ہو کر بولا "میرے کُچھ ساتھی جو میرے ساتھ خوف ناک مُہمّوں میں شریک ہو چُکے ہیں، جہاز سے اُتر کر اس طرف آئے تھے۔ میں نے اُنہیں اس لیے بھیجا تھا کہ وہ ہمارے رہنے کے لیے مُناسب جگہ اور کھانے کے لیے خوراک تلاش کریں۔ ایک ہفتہ ہونے کو آیا، ان میں سے ایک بھی لوٹ کر نہ آیا۔ آخر تنگ آ کر آج میں اُن کی تلاش میں نِکلا ہُوں۔ کہیں ان کو بھی اُس جادُوگرنی نے جانور تو نہیں بنا دیا؟"

سِلوَر ہنستے ہوئے بولا۔ "اُنہیں سرس نے دُنبے بنا دیا ہے۔ اور میں اس بات پر حیران نہیں ہُوا۔ وہ تھے ہی اسی قابل۔ سرس نے اُنہیں کھانے کی دعوت دی تو وہ کھانے پر یُوں پل پڑے جیسے بھُوکے دُنبے گھاس کھاتے ہیں۔ اُس نے کہا کہ میں نے زندگی میں اتنے لالچی اور بھُوکے لوگ کبھی نہیں دیکھے اور اُنہیں دُنبے

بنا دیا۔"

یُولی سس حیران ہو کر بولا۔ "کیا کہا؟۔۔۔ دُنبے۔۔۔؟ وُہ سوچنے لگا کہ بیس بہادُر اِنسانوں کی جگہ وہ بیس دُنبے لے کر کیسے واپس جائے گا؟

اُس نے سِلوَر سے پوچھا۔ "تو کیا میں اُن کی کُچھ مدد نہیں کر سکتا؟"

سِلوَر نے کہا یہ کام کرنے کے لیے تُمھیں دُنیا جہان کی عقل اِستعمال کرنی ہو گی، کیوں کہ اگر تُم ناکام ہو گئے تو سرس تُمھیں لومڑی بنا دے گی۔ لیکن اگر تُم میرے کہنے پر عمل کرو تو خُود بھی بچ جاؤ گے اور اپنے آدمیوں کو بھی دوبارہ انسان بنا کر ساتھ لے جا سکو گے۔"

باتیں کرتے ہوئے سِلوَر ٹکٹکی باندھ کر زمین کی طرف دیکھ رہا تھا۔ زمین پر ایک سُوکھا ہُوا پھُول پڑا تھا۔ اس کا رنگ سفید تھا۔ سِلوَر نے وُہ پھُول اُٹھایا اور اُسے سُونگھنے لگا۔ چند ہی لمحوں میں مُرجھایا ہُوا پھُول کِھل اُٹھا۔

سِلوَر نے پھُول یُولی سس کو دیتے ہوئے کہا "یہ پھُول لے جاؤ۔ اس کی حفاظت

کرنا۔ اس لیے کہ اس کے ساتھ کا دُوسرا پھُول دُنیا بھر نہ ملے گا۔ جب تُم سنگِ مرمر کے محل میں داخل ہوئے تو اُسے اپنے ہاتھ میں مضبُوطی سے پکڑے رکھنا اور لگاتار سُونگھتے رہنا۔ خاص طور پر اُس وقت جب سرس تُمھیں کُچھ کھانے کو یا پینے کو دے۔ اگر تُم اس بات کا خیال رکھو گے تو اُس کے جادُو کے اثر سے بچ نکلو گے۔ "

یُولی سس نے اپنے مہربان دوست کا شکریہ ادا کیا اور جب اُسے الوداع کہنے کے لیے مُڑا تو وہ جا چُکا تھا۔

یُولی سس سرس کے محل کے باہر چبوترے کے پاس پہنچا تو کئی شیر، چیتے اور بھیڑیے اُس کے اِستقبال کو بھاگے آئے۔ لیکن یُولی سس نے اپنے نیزے کی نوک اُن کی طرف کر دی تاکہ وُہ اُس سے دُور رہیں۔

نیزے سے ڈر کر درندے واپس چلے گئے۔



چبوترا پار کر کے یُولی سس محل کے اندر داخل ہو گیا۔ یہاں اُسے ایک بہت خُوب صُورت فوّارہ نظر آیا، جس کا پانی سنگِ مرمر کی چمکتی ہُوئی چھت سے ٹکرا کر واپس آتا تو پہلے ایک آدمی کی شکل اِختیار کرتا، پھر شیر کی شکل میں ڈھلتا اور پھر بھیڑیے کی شکل اِختیار کر لیتا۔ یہ بہت ہی عجیب نظّارہ تھا لیکن یُولی سس یہاں زیادہ دیر نہ رُکا۔

وہ آگے بڑھا ہی تھا کہ ایک کمرے کے اندر سے کسی عورت کے گانے کی آواز آئی اور ساتھ ہی ایسا معلُوم ہُوا جیسے بہُت سے لوگ کھڈّیوں پر کپڑا بُن رہے ہیں۔ اس کے علاوہ کئی لڑکیوں کی آوازیں بھی سُنائی دے رہی تھیں جو بار بار ہنس رہی تھیں۔ اُس نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔

اُس کے اندر داخل ہوتے ہی ایک نہایت خُوب صُورت عورت کھڈّی سے اُٹھ کر اُس کے اِستقبال کو آئی اور مُسکرا کر سلام کیا۔ یہ سرس تھی۔ وہ یُولی سس سے بولی :

”خوش آمدید، بہادر اجنبی۔ ہم تُمہارے ہی اِنتظار میں تھے۔“

پھر وہ بولی ”آپ کے ساتھیوں کی یہاں بہت آؤ بھگت کی گئی۔ اُنہیں جو کُچھ چاہیے تھا، دیا گیا۔ میں ابھی تھوڑی دیر میں آپ کو اِن سے ملاؤں گی۔ آپ ذرا آرام کر لیں۔ ہم ابھی ایک کپڑا بُن رہے تھے جس پر آپ کے ساتھیوں کی شکلیں بنائی گئی ہیں۔ وہ دیکھیے۔۔۔“

یہ کہہ کر سرس نے ایک کھڈّی کی طرف اِشارہ کیا جس میں خُوب صُورت رنگوں

میں کپڑا بُنا گیا تھا۔ کپڑے پر رنگ برنگ دھاگوں سے یُولی سس کے بیس ساتھیوں کی تصویریں بنائی گئی تھیں اور اُنہیں کھانا کھاتے دِکھایا گیا تھا۔ یُولی سس کے ساتھی خُوب صُورت تختوں پر بیٹھے بڑے بھونڈے طریقے سے کھانا کھارہے تھے۔

ان تصویروں کے آگے ابھی کپڑا نہیں بُنا گیا تھا۔ چالاک جادُوگرنی ابھی یہ بتانا نہ چاہتی تھی کہ اُس کی جادُو کی طاقت اِنسان کو کیا سے کیا بنا سکتی ہے۔

وہ یُولی سس سے بولی۔ "آپ کے چہرے سے اور بات چیت سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ آپ کِسی مُلک کے بادشاہ ہیں۔ چُناں چہ آپ کے ساتھ بادشاہوں ہی کا سا سلوک کیا جائے گا۔ آیئے، تشریف لایئے۔"

اب سرس اُسے لے کر ایک گول کمرے میں داخل ہُوئی۔ یہی وہ کمرا تھا جہاں یُولی سس کے ساتھیوں نے کھانا کھایا تھا۔ جب سے یُولی سس نے محل کے اندر قدم رکھا تھا، وہ کئی بار پھُول سُونگھ چُکا تھا۔ اب جو وُہ اُس کمرے میں داخل ہُوا تو اُس نے پھُول کو لگاتار کئی بار سُونگھا تا کہ اُس کی خُوش بُو کا اثر دیر قائم رہے۔

اس وقت اس کمرے میں بیس کے بجائے صرف ایک ہی تخت بچھا ہُوا تھا۔ لیکن یہ اِتنا خُوب صُورت تھا کہ بادشاہ ہوتے ہوئے بھی یُولی سس نے ایسا تخت کبھی نہ دیکھا تھا۔ خالص سونے کے اس تخت میں ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ درمیان میں سُرخ رنگ کی ایک گدّی تھی جو گُلاب کے پھُولوں کی نظر آتی تھی۔

سرس نے یُولی سس کو نہایت ادب سے اس تخت پر بٹھایا۔ پھر اُس نے تالی بجائی تو ایک مُلازِم آکر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

سرس بولی۔ "وہ پیالہ لاؤ جو میں صِرف بادشاہوں کو پیش کیا کرتی ہُوں۔ اُسے شاہی شربت سے بھرو جو میرے شہزادے بھائی کو بُہت پسند ہے اور جو صرف بادشاہوں اور شاہ زادوں کے لیے ہے۔"

ملازم شربت لینے گیا تو یُولی سس نے پھر پھُول سُونگھا شروع کر دیا۔ پھر سرس سے پُوچھا۔ "کیا واقعی آپ کے پاس بُہت عُمدہ شربت ہے؟"

سرس بولی "اس سے بہتر شربت دُنیا میں کہیں نہیں مل سکتا۔ دُوسرے شربت تو نیند لاتے ہیں، یہ آدمی کو زیادہ ہوشیار بنا دیتا ہے۔"

اتنے میں ملازِم شربت سے بھرا ہُوا پیالہ لے آیا۔ اُسے لوگوں کو جانور بنتا دیکھ کر بڑا لُطف آتا تھا۔ اُس نے جھک کر پیالہ یُولی سس کو پیش کر دیا۔

شربت دیکھنے میں تو بڑا خوش رنگ تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُس کے ہر گھونٹ پر جادُو کیا ہُوا تھا۔ پینا تو دُور کی بات ہے، اس کی خُوش بُو ہی سے آدمی کے سینگ نکلنے شروع ہو جاتے یا شیر کے سے پنجے بن جاتے یا لومڑی کی طرح کان نِکل آتے۔

سرس بولی۔ "عالی جاہ، پیجیے۔ شوق فرمایئے۔ یہ شربت آپ کے تمام دُکھوں کا خاتمہ کر دے گا۔ ذرا چکھ کر تو دیکھیے۔"

یُولی سس نے دائیں ہاتھ میں پیالہ پکڑا اور بائیں ہاتھ ہاتھ میں پھُول۔ وُہ پھُول کو ناک کے نزدیک لایا اور اُسے سُونگھتے ہُوئے لمبا سانس لیا۔ یہاں تک کہ اُس کے پھیپھڑوں میں اس پھُول کی خُوش بُو خُوب بھر گئی۔ اس کے بعد اُس نے تمام شربت ایک ہی سانس میں غٹا غٹ پی لیا اور پھر سرس کی طرف دیکھنے لگا۔

سرس بُہت حیران ہوئی۔ اب تک تو یہ ہوتا رہا تھا کہ جُوں ہی اُس نے شربت کا

پیالہ کِسی کے ہاتھ میں دیا، اُس کی شکل بدلنا شروع ہو گئی۔ شربت کے ختم ہونے تک وہ مکمّل جانور بن جاتا تھا۔ لیکن یُولی سس پر اُس کا کُچھ بھی اثر نہ ہوا۔ یہ دیکھ کر سرس غصّے سے پاگل ہو گئی۔ بولی :

"کمال ہے، تُم ابھی تک انسان ہی ہو۔ "

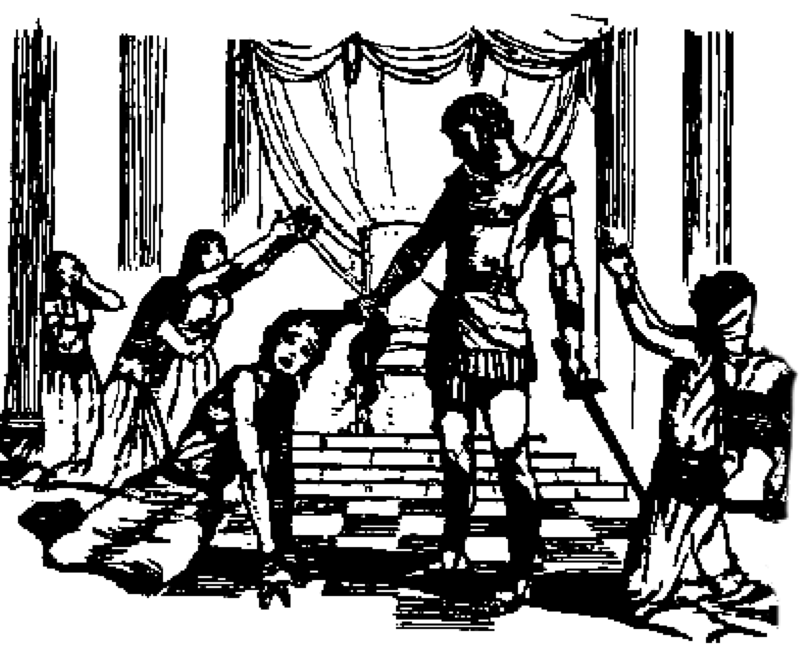
پھر اُس نے اپنا جادُو کا ڈنڈا یُولی سس کے کندھے پر مار کر کہا۔ "تُمہاری شکل جِس جانور سے بھی ملتی ہے، فوراً وہی بن جاؤ اور جا کر اپنے ساتھیوں میں خُوب چیخو چلّاؤ۔ "

وہ غصّے میں بکتی جا رہی تھی "میرا جادُو کا شربت پی کر اب تُم زیادہ دیر اِنسان نہیں رہ سکتے۔ "

یُولی سس اُس کے غصّے پر مُسکرا رہا تھا۔ وہ کوئیک سِلوَر کے دیے ہُوئے پھُوں کو کافی سُونگھ چُکا تھا۔ بجائے اس کے کہ وہ کِسی جانور کی شکل اِختیار کرتا، پہلے سے زیادہ ذہین اور بارُعب دکھائی دینے لگا۔ چند لمحوں بعد وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور پیالہ زور سے دیوار پر دے مارا۔ پر تلوار نکال کر سرس کی چوٹی پکڑ لی۔ سرس کے

خُوب صُورت اور ریشمی بال یُولی سس کے ہاتھ میں تھے۔

وُہ غصّے سے بولا۔ "چالاک جادُوگرنی، میں ابھی اس تلوار سے تُجھے جہنّم میں پہنچاتا ہُوں۔ اب تو کبھی کِسی آدمی کو جانور نہیں بنا سکے گی۔"



یُولی سس کی چمکتی ہوئی تلوار دیکھ کر سرس کے ہُوش اُڑ گئے اور وہ خوف سے کانپنے لگی۔ مُلازم پیالہ اُٹھا کر بھاگا۔ سرس اور اُس کی نوکرانیاں یُولی سس کے

پاؤں پر گر گئیں اور رحم کی بھیک مانگنے لگیں۔

سرس بولی ”خُدا کے لیے مُجھے چھوڑ دو۔ اب مُجھے پتا چل گیا ہے کہ تُم کون ہو۔“ سِلوَر نے مُجھے بتایا تھا کہ دُنیا میں تُم ہی وہ شخص ہو جو مُجھ پر فتح پا سکتا ہے۔ خُدا کے لیے مُجھے چھوڑ دو۔ “

سرس کے علاوہ اُس کی نوکرانیوں نے بھی بڑی مِنّتیں کیں لیکن یُولی سس نے اُس وقت تک اُن کی بات سُننے سے اِنکار کر دیا جب تک وہ اُس کے ساتھیوں کو دوبارہ اِنسانی شکل میں واپس نہ لے آئیں۔

سرس پچھلے دروازے سے یُولی سس کو لے کر باہر نِکلی اور اُسے وہاں لے گئی جہاں بہُت سے دُنبے بندھے ہوئے تھے۔ یُولی سس کے لیے اُن میں سے اپنے ساتھیوں کو پہچاننا بہُت مُشکل تھا۔ لیکن اچانک اُس نے دیکھا کہ ان میں سے بیس دُنبے باقی دُنبوں سے علیحدہ ہو کر آگے آ رہے ہیں۔ اُن کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کریں۔ وہ زور زور سے زمین پر پاؤں مارنے لگے۔ جب نوکرانیوں میں سے ایک نے اُن کے سامنے کُچھ چنے پھینکے تو وہ بھُوکوں کی طرح اُن پر پل پڑے،

جیسے کئی دِنوں سے بھوکے ہوں۔

یُولی سس بے چینی سے بولا۔ ”اب اِنہیں جلد واپس انسانوں کی شکل میں لے آؤ۔“

سرس نے اپناڈنڈا گھمایا اور کچھ جادُو کے الفاظ کہے۔ اِن الفاظ کے سُنتے ہی دُنبوں کے کان کھڑے ہو گئے۔ یہ بڑا ہی عجیب نظّارہ تھا۔ اُن کی شکلیں آہستہ آہستہ بدلنے لگیں۔ پہلے کان چھوٹے ہُوئے۔ پھر مُنہ گُول ہوئے۔ پھر وہ سب اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑے ہو گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کی اگلی ٹانگیں بازوؤں میں تبدیل ہو گئیں۔ پھر وہ انسان بن گئے اور یُولی سس سے بولے :

”شکریہ۔ آپ نے ہمیں دوبارہ انسان بنا دیا۔“

عین اُسی وقت ایک درخت سے ایک پرندے کی آواز آئی۔ یُولی سس نے دیکھا کہ یہ وہی خُوب صُورت پرندہ تھا جو اُسے پہلے بھی دکھائی دیا تھا۔ یُولی سس نے سرس کو حکم دیا کہ اُسے فوراً اصل حالت میں واپس لایا جائے۔

درخت سے بادشاہ پائیکس کُود کر نیچے اُترا۔ اُس نے خُوب صُورت کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ گلے میں سونے کا ہار اور سر پر تاج تھا۔ اُس نے یُولی سس کا شکریہ ادا کیا اور اپنے مُلک کو روانہ ہو گیا۔

اب یُولی سس نے اپنے باقی ساتھیوں کو بھی جہاز پر سے بُلا لیا۔ وہ اُس وقت تک وہاں رہے، جب تک تازہ دم نہ ہو گئے۔ اس کے بعد وہ اپنے وطن کو روانہ ہو گئے۔

جیسن اور سُنہری اُون

جیسن نے بچپن میں ایک بہت لائق اُستاد سے تعلیم حاصل کی تھی۔ اس اُستاد کا نام چِرن تھا۔ اُس کا سر اور کندھے آدمی کے اور باقی جسم سفید گھوڑے جیسا تھا۔ لیکن تعلیم کے مُعاملے میں وہ بُہت قابل تھا۔

چِرن اپنے شاگردوں کو بُہت کُچھ سکھاتا۔ بیماریوں کا علاج، تلوار اور ڈھال کا اِستعمال، موسیقی اور دُوسری بُہت سی مُفید چیزیں۔ اس کے شاگردوں نے دُنیا میں بُہت نام پیدا کیا۔ آخرکار وہ دِن آیا کہ جیسن کی تعلیم مکمّل ہو گئی۔ یہ اُسے معلُوم ہو چُکا تھا کہ اُس کا باپ ایک بادشاہ تھا، جس کا نام ایلیسن تھا۔ اور یہ بھی اُسے پتا چل گیا تھا کہ ایک شخص پیلاس نے اُس کے باپ سے دھوکے سے اُس کا تخت چھین لیا تھا اور اس کی موت کے بعد اس کے مُلک الکوس پر حکُومت کر رہا تھا۔

جیسن نے پکّا اِرادہ کر لیا تھا کہ وہ اس جھُوٹے بادشاہ سے اپنے باپ کا تخت واپس چھین لے گا کیوں کہ باپ کے بعد جیسن ہی کو حکُومت کا حق پہنچتا تھا۔

وہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے چرن کو بتائے بغیر چل پڑا۔ بارش اور دُھوپ سے بچنے کے لیے اُس نے چیتے کی کھال پہنی اور دونوں ہاتھوں میں دو نیزے لے لیے۔

جیسن کے پاس اپنے باپ کے جُوتوں کا ایک نہایت خُوب صُورت جوڑا تھا۔ ان پر خُوب صُورت نقش بنے ہُوئے تھے اور تسمے سونے کے تھے۔ یہی جُوتے اِس وقت جیسن نے پہنے ہوئے تھے۔ وہ جس طرف سے بھی گُزرتا، لوگ حیران ہو کر اُسے دیکھتے کہ یہ کون بہادُر نوجوان ہے جو یُوں دائیں بائیں دیکھے بغیر چلا جا رہا ہے۔

چند میل چلنے کے بعد اُس کے راستے میں ایک دریا آیا، جس میں سیلاب آیا ہُوا تھا۔ اس میں اُکھڑے ہُوئے درخت اور مویشی بہے چلے جا رہے تھے اور ایسا معلُوم ہوتا تھا کہ اگر ایسے میں کشتی سے دریا پار کرنے کی کوشش کی گئی تو کشتی

کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔

جیسن اچھی سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے کہ پاس ہی سے ایک آواز آئی :

”آہ! شاید بے چارے کو تیرنا نہیں آتا۔ یا شاید سیلاب سے ڈرتا ہے۔ اگر اُس کا چار پاؤں والا اُستاد یہاں ہوتا تو وہ اُسے اپنی پیٹھ پر سوار کر کے پار لے جاتا۔ “

جیسن نے حیران ہو کر اِرد گرد نظر دوڑائی تو اُسے ایک بُڑھیا نظر آئی جو چھڑی کا سہارا لیے کھڑی تھی۔ چھڑی کے اُوپر کوئل کی شکل کا ایک پرندہ بنا ہوا تھا۔

بُڑھیا کے چہرے پر جھُرّیاں پڑی ہوئی تھیں لیکن اُس کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی کہ جیسن اُس سے آنکھیں نہ ملا سکا۔

بُڑھیا کی آنکھیں بھُوری بھُوری اور بہُت خُوب صُورت تھیں۔ اگرچہ اُن دِنوں انار کا موسم نہ تھا، لیکن اس کے ہاتھ میں ایک انار تھا اور اس کے پاس ایک مور کھڑا تھا۔



بُڑھیا نے پُوچھا۔ ”جیسن، کہاں جا رہے ہو؟“

جیسن اپنا نام بُڑھیا کے مُنہ سے سُن کر حیران ہوا۔ اُس نے بُڑھیا کی آنکھوں میں جھانکا تو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ گُزرے ہوئے اور آنے والے زمانے کے متعلّق سب کُچھ جانتی ہو۔

جیسن بولا۔ ”میں الکوس جا رہا ہُوں۔ وہاں پیلاس میرے باپ کے تخت پر قبضہ جما کر خُود بادشاہ بن بیٹھا ہے۔ میں اُسے اُس کی شرارت کا مزا چکھاؤں گا۔“

بُڑھیا بولی۔ ”تو پھر تُمھیں جلدی کرنے کی ضرورت نہیں۔ مُجھے اپنی پیٹھ پر سوار کرا کے دریا پار کراؤ۔ مُجھے اور میرے مور کو بھی اِتنا ہی ضرُوری کام ہے، جتنا تُمھیں۔“

جیسن بولا۔ ”مُجھے آپ کی خدمت کر کے بڑی خُوشی ہوتی، لیکن اس وقت دریا میں سیلاب آیا ہوا ہے۔ اگر میرے پاؤں اُکھڑ گئے تو میرے ساتھ آپ کی جان بھی جائے گی۔ اس کے عِلاوہ میرا خیال ہے کہ میں ابھی اتنا طاقت ور نہیں کہ آپ کو اُٹھا کر دریا پار کرا سکُوں۔“

بُڑھیا نے کہا۔ ”اگر تُم ایک ضعیف بُڑھیا کی مدد کرنے کی طاقت نہیں رکھتے تو پھر تُم پیلاس سے اپنا تخت بھی نہ چھین سکو گے۔ تُمھیں بادشاہ بننے کا کوئی حق نہیں۔ آخر بادشاہ اور کِس لیے ہوتے ہیں؟ اِسی لیے نا کہ وہ غریبوں اور ضرورت مندوں کی خدمت کریں۔ خیر اگر تُم مُجھے پار نہیں لے جا سکتے تو میں خُود کوشش کروں گی۔“

جیسن کو اپنے اُستاد چرن کی نصیحت یاد آ گئی کہ طاقت کا سب سے اچھّا اِستعمال یہ

ہے کہ کمزوروں اور ضعیفوں کی مدد کی جائے۔ چرن نے اِسے یہ بھی ہدایت کی تھی کہ وہ ہر جوان عورت کو اپنی بہن اور ہر بوڑھی عورت کو اپنی ماں سمجھے۔ یہ خیال آتے ہی جیسن اپنے سلوک پر بُہت شرمندہ ہُوا۔

وہ بُڑھیا سے بولا "آیئے امّاں، میری پیٹھ پر سوار ہو جایئے۔ میں پُوری کوشش کروں گا کہ آپ کو دریا کے پار پہنچا دُوں۔"

بُڑھیا جیسن کی پیٹھ پر سوار ہو گئی اور اپنی بانہیں اُس کے گلے میں ڈالتے ہوئے بولی:

"ڈرو مت۔ ہم ضرُور دریا کو عبور کر لیں گے۔"

مور اُڑ کر بُڑھیا کے کندھے پر بیٹھ گیا۔

جیسن پانی میں اُتر گیا۔ دونوں نیزے اُس نے اپنے ہاتھوں میں پکڑ لیے۔ ہر قدم کے ساتھ پانی زیادہ گہرا ہوتا گیا اور زیادہ تیز بھی۔ دریا میں سیلاب تھا اور یوں لگتا تھا کہ جیسن کے پیر اُکھڑ جائیں گے۔

جب وہ دریا کے عین درمیان میں پہنچے تو ایک درخت اُن کی طرف بہتا ہوا آیا۔ اُس کی شاخیں پانی میں پھیلی ہُوئی تھیں۔ جیسن نے درخت سے بچنے کے لیے تیزی سے ہاتھ پاؤں مارنے شرُوع کیے۔ اس کوشش میں اس کا ایک پاؤں نیچے چٹان میں پھنس گیا۔ اس نے جھٹکے سے پاؤں نکال تو اُس کا خُوب صُورت جُوتا، جو اس کے باپ کی نشانی تھا، پاؤں سے نکل گیا۔

یہ جیسن کے لیے بہُت بڑا صدمہ تھا۔ اس کی چیخ نِکل گئی۔

بُڑھیا بولی۔ ”کیا بات ہے جیسن؟ کیا ہُوا؟“

میرا ایک جُوتا پانی میں رہ گیا ہے۔ اب میں پیلاس کے دربار میں ننگے پاؤں کیسے جاؤں گا۔ سب لوگ میرا مذاق اُڑائیں گے۔“

بُڑھیا بولی۔ ”فکر نہ کرو۔ یہ تو تُمہارے لیے بہت ہی اچھّا شگُون ہے۔ اب تو ثابت ہو گیا کہ تُم ہی وہ نوجوان ہو جِس کے متعلّق شاہِ بلوط کے درخت نے بھی گواہی دی تھی۔“

بُڑھیا کی اس بات پر جیسن کو حیرانی تو بہت ہوئی لیکن اس وقت باتیں کرنے کا موقع نہ تھا۔ وہ کنارے تک پہنچنے کے لیے پورا زور لگا رہا تھا۔

اچانک اُسے اِحساس ہُوا کہ بُڑھیا کو اپنی پیٹھ پر بٹھانے سے پہلے اُس نے کبھی اپنے آپ کو اِتنا طاقت ور محسوس نہیں کیا تھا جتنا اب کر رہا تھا۔

کنارے پر پُہنچ کر اُس نے بُڑھیا کو گھاس پر کھڑا کر دیا۔ بُڑھیا بولی:

"تُمھیں کُچھ عرصے بعد اس سے زیادہ خُوب صُورت جُوتے مل جائیں گے۔"

یہ کہہ کر بُڑھیا مُسکرائی اور پھر بولی۔ "تُمھارا ایک پاؤں ننگا دیکھ کر بادشاہ پیلاس خُوف زدہ ہو جائے گا۔ اچھّا جیسن، اب تم جاؤ۔ وُہ رہا تُمھارا راستہ۔ میری دعائیں تُمھارے ساتھ ہیں۔ جب پیلاس سے اپنا تخت چھین کر بادشاہ بنو تو مُجھے ضرور یاد رکھنا۔"

یہ کہہ کر بُڑھیا لنگڑاتی ہُوئی چل دی۔ وُہ مُسکرا رہی تھی۔ مور اپنے پَر پھیلائے اُس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ کُچھ دِن لگاتار چلنے کے بعد جیسن آخر کار الکوس

پہنچ گیا۔ جُوں ہی وہ شہر میں داخل ہُوا لوگوں کا دھیان اُس کے ایک ننگے پیر پر گیا اور وہ ایک دوسرے سے کہنے لگے :

"ایک جوتے والا نوجوان آ گیا ہے۔ آخر کار اُس کو آنا ہی تھا۔ اب تو بادشاہ کی کم بختی آ گئی۔ اب کیا کرے گا وہ؟ "

جیسن نے لوگوں کی باتوں کی طرف دھیان نہ دیا۔ اُسے لوگوں سے کیا غرض۔ اُسے تو بادشاہ کی تلاش تھی، جس سے اُس کو اپنے باپ کا بدلہ لینا تھا۔ وہ شہر کی گلیوں، محلّوں میں سے ہوتا ہوا سمندر کے کنارے پہنچا۔

یہاں پیلاس بادشاہ ایک سیاہ بیل کی قربانی دینے والا تھا اور یہ تماشا دیکھنے کے لیے لوگوں کا زبردست ہجوم اکٹھّا ہو گیا تھا۔

بیل قربان کرنے کی کارروائی ابھی شروع نہ ہوئی تھی۔ چمکتی ہوئی تیز چھُری، جس سے بیل کو ذبح کیا جانا تھا، پیلاس بادشاہ کے ہاتھ میں تھی۔ بیل کو لِٹایا جا چُکا تھا۔ قریب تھا کہ پیلاس چھُری چلا دے کہ اس کی نظر جیسن پر پڑی۔ لوگ بُڑبُڑانے لگے۔ وہ ایک دُوسرے سے کہہ رہے تھے "ایک جُوتے والا نوجوان آ

گیا۔ پیش گوئی پوری ہو گئی۔ اب کیا ہو گا؟“

اس سے کئی سال پہلے ایک بار پیلاس بادشاہ نے نجومیوں کو بلایا تھا۔ اُس نے تخت پر زبردستی قبضہ کیا تھا، اس لیے وہ ہمیشہ خوف زدہ رہتا تھا۔

جب اُس نے نجومیوں سے آنے والے حالات کے متعلّق پُوچھا تو اُنہوں نے اُسے بتایا کہ ایک ایسا نوجوان اُس سے تخت چھین لے گا جس کے صرف ایک پاؤں میں جُوتا ہو گا۔

بادشاہ نے اُسی وقت حکم دے دیا تھا کہ اِس بات کا سختی سے خیال رکھا جائے کہ ایسا کوئی شخص اُس کے پاس نہ پھٹکنے پائے جو صرف ایک جُوتا پہنے ہو۔ اس کے دربار میں آنے سے پہلے ہر شخص کی پڑتال کی جاتی تھی کہ اُس کے دونوں جوتے موجود ہیں۔ لیکن یہاں تو کھُلی جگہ تھی۔ سمندر کا کنارہ تھا۔ یہاں یہ پابندی بھلا کیسے مُمکن تھی۔

پیلاس کی نظر جُوں ہی جیسن پر پڑی، وہ خوف زدہ ہو گیا۔ اس کا دِل کانپ رہا تھا کہ یہ شخص جو ایک جُوتا پہنے ہے مُجھ سے میرا تخت چھین لے گا۔ لیکن اس نے

اپنا خوف ظاہر نہ ہونے دیا۔

اس نے جیسن سے کہا "تُم لباس سے اجنبی نظر آتے ہو۔ ہم مہمانوں کی خدمت کیا کرتے ہیں۔ ہم تُمہیں اپنے شہر میں خُوش آمدید کہتے ہیں۔ کہاں سے آئے ہو تُم؟ کیا نام ہے تُمہارا؟ "

جیسن بولا۔ "میرا نام جیسن ہے۔ میں اُستاد چرن کا شاگرد ہُوں، اور اُسی سے تعلیم حاصل کرتا رہا ہوں۔ اس شہر میں آج ہی آیا ہوں۔ "

پیلاس چرن کو جانتا تھا۔ اُس نے جیسن سے سوال کیا۔ "کیا چرن نے تُمہیں کافی عقل مند بنا دیا ہے؟ اس کے شاگردوں سے مل کر مُجھے بڑی خوشی ہوتی ہے۔ "

جیسن بولا۔ "مُجھے عقل مندی کا دعویٰ تو نہیں ہے، پھر بھی میرے اُستاد نے مُجھ پر بڑی محنت کی ہے۔ آپ پوچھیئے۔ میں آپ کے سوال کا جواب دینے کی کوشش کرُوں گا۔"

پیلاس بولا۔ "اچھّا، یہ بتاؤ کہ اگر تُمہارے قابو میں ایک ایسا آدمی آجائے جو

تُمہارا دُشمن بھی ہو اور جو تُمہیں تباہ کر دینے کی پوری طاقت بھی رکھتا ہو، تو تُم اس سے کیا سلوک کرو گے؟ "

جیسن نے پیلاس کے چہرے سے اندازہ لگایا کہ اس کی نیّت اچھّی نہیں ہے۔ اُسے اس بات کا پہلے ہی خدشہ تھا۔ کیوں کہ کوئی بھی بادشاہ آسانی سے اپنا تخت چھوڑنے کو تیّار نہیں ہوتا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اس کے ہر سوال کا جواب ٹھیک ٹھیک دے گا۔

اس نے کہا "اگر میرا کوئی دُشمن میرے قابو میں آجائے تو میں اُسے مُصیبت میں ڈالنے کی کوشش کروں گا۔ اُسے تنگ کروں گا۔ اُسے سونے کی اُون لانے کو کہوں گا۔"

جیسن نے ایک ایسی بات کہہ دی تھی جس سے بڑھ کر مُشکل دنیا میں شاید ہی کوئی ہو۔ سُنہری اُون لانے کے لیے تو نہ معلُوم کتنے سمندروں اور دریاؤں میں سے گُزرنا پڑتا ہے۔ وہ تو بڑا جان جوکھوں کا کام ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ سُنہری اُون کی تلاش میں گیا ہُوا کوئی بھی شخص آج تک زندہ واپس نہیں آیا تھا۔

پیلاس کو اور کیا چاہیے تھا۔ یہی تو وہ چاہتا تھا کہ جیسن سے کِسی طرح پیچھا چھُوٹ جائے۔ وہ بولا :

"بہُت اچھّا، میرے دوست جاؤ اور سُنہری اُون لے کر آؤ۔" "میں ضرور جاؤں گا۔" جیسن جوش سے بولا۔ "لیکن ایک بات یاد رکھو۔ اگر میں سُنہری اُون لانے میں کام یاب ہو گیا تو تُمھیں یہ تخت و تاج مُجھے دینا ہو گا۔"

پیلاس ناک چڑھا کر بولا۔ "ہاں ہاں۔۔۔ اگر تُم واپس آ گئے جبھی لو گے نا۔ میں تُمہارے واپس آنے تک اِن چیزوں کی حفاظت کروں گا۔ تُم جاؤ تو سہی۔ سُنہری اُون تو لاؤ۔"

اس مشکل مُہم پر جانے کا اِرادہ کرنے کے بعد سب سے پہلا کام جیسن نے یہ کیا کہ شاہ بلوط کے اُس درخت کے پاس گیا جس کے متعلّق مشہور تھا کہ وہ باتیں کرتا ہے، اور لوگوں کو آیندہ کے حالات بتاتا ہے۔ یہ ایک بہُت ہی بُوڑھا اور عجیب قسم کا درخت تھا جو ایک پُرانے جنگل کے عین درمیان میں واقع تھا۔ یہ اتنا بُوڑھا اور لمبا چوڑا تھا کہ زمین کے ایک ایکڑ رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔

اس سے پہلے جیسن کو کبھی اس درخت سے بات کرنے کا اتّفاق نہ ہُوا تھا۔ وہ اس کے گھنے پتّوں اور لمبی لمبی ٹہنیوں کو غور سے دیکھنے لگا۔ اُس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ اس درخت سے بات کرنے کا طریقہ کیا ہے۔

کُچھ دیر غور کرنے کے بعد جب اُس کی سمجھ میں کُچھ نہ آیا تو اس نے اپنے آپ سے کہا:

"میں کیا کروں؟ سُنہری اُون حاصل کرنے کے لیے مُجھے کیا کرنا چاہیے؟"

ہر طرف خاموشی تھی۔ تھوڑی دیر بعد جیسن کو یُوں لگا جیسے درخت کے پتّے آپس میں ہولے ہولے باتیں کر رہے ہیں۔ پتّوں کی سرسراہٹ آہستہ آہستہ آواز میں تبدیلی ہو گئی جو دھیرے دھیرے اُونچی ہوتی گئی، یہاں تک کہ درخت میں سے ایک آواز آئی:

"ایک آدمی ہے، جس کا نام آرگس ہے۔ وُہ بُہت عُمدہ سمندری جہاز بناتا ہے۔ اس کے پاس جاؤ اور کہو کہ وُہ تُمہارے لیے ایک ایسا جہاز بنا دے جس کے پچاس چپّو ہوں۔"

جیسن بُہت خُوش ہوا۔ اُسے سُنہری اُون لانے کے لیے درخت سے پہلی ہدایت مل گئی تھی۔ اب اُس کو اپنا تخت و تاج واپس لینا مُمکن نظر آنے لگا۔

جیسن شہر میں آیا اور لوگوں سے آرگس کے متعلّق پُوچھنے لگا۔ اُسے جلد ہی آرگس کا پتا مل گیا، کیوں کہ وُہ کوئی گُم نام آدمی نہ تھا، بلکہ جہاز بنانے میں بُہت مشہور تھا۔ لیکن اُس نے اس سے پہلے کبھی پچاس چپّوؤں والا جہاز تیّار نہیں کیا تھا۔

جب جیسن نے آرگس کو ساری بات بتائی تو وُہ اس شرط پر جہاز بنانے کو تیّار تھا کہ جہاز کا نام اُس کے نام پر رکھا جائے گا۔ جیسن رضامند ہو گیا۔

آرگس نے اپنے کاری گروں کی مدد سے ایک نہایت خُوب صُورت اور مضبُوط پچاس چپّوؤں والا جہاز تیّار کیا اور اُس کا نام "آرگو" رکھا گیا۔

اس کام سے فارغ ہو کر جیسن اگلی ہدایت لینے کے لیے پھر بولنے والے درخت کے پاس پُہنچا اور اُس سے سوال کیا کہ اب میں کیا کروں؟

اس بار درخت کے پتّوں نے آپس میں باتیں نہ کیں۔ اس کے بجائے درخت کی ایک لمبی سی ٹہنی بولی :

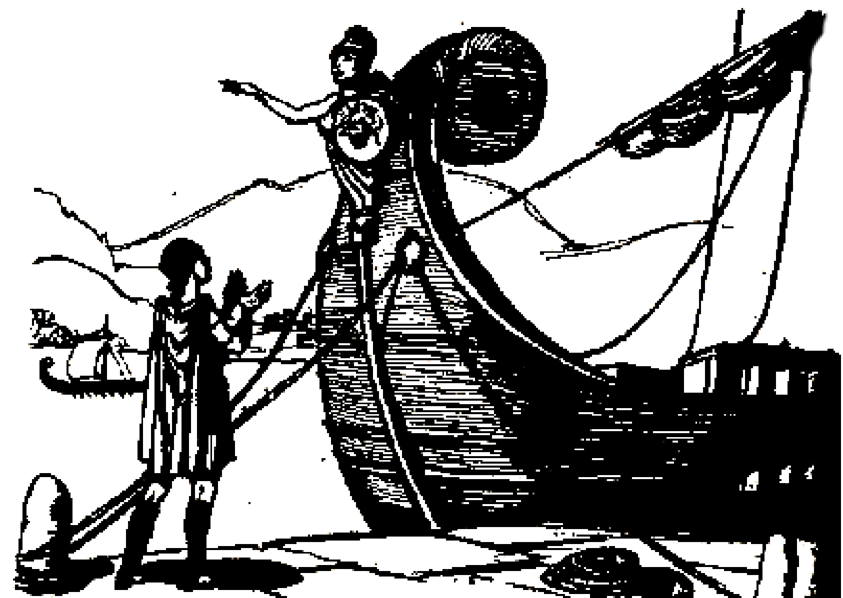
"مُجھے کاٹ لو اور آرگس سے کہو کہ مُجھے تراش کر اِنسان کی شکل بنائے اور جہاز کے آگے لگادے۔ "

ان دِنوں یہ رواج تھا کہ جہاز کے آگے ایک انسانی شکل بنا کر لگادی جاتی تھی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ انسان کا پُتلا جہاز کو صحیح راستہ دکھاتا ہے اور جہاز کو طوفانوں میں سے صحیح سالم نِکال کر لے جاتا ہے۔

جیسن نے ایسا ہی کیا۔ درخت کی ٹہنی کاٹ کر آرگس کو دے دی۔ اس نے ایک تجربہ کار کاری گر کو اس کام پر لگادیا کہ وہ لکڑی میں، کھُدائی کر کے، انسانی شکل بنا دے۔ لیکن جب کاری گر نے کام شروع کیا تو اُس نے ایسا محسوس کیا جیسے کوئی چھُپی ہوئی طاقت اُس کے ہاتھوں سے ایک خاص قسم کی شکل بنوا رہی ہے۔ جو شکل کاری گر بنانا چاہتا تھا وہ بنتی ہی نہ تھی، بلکہ کُچھ اور ہی بن رہا تھا۔

جب کام ختم ہو گیا تو کاری گر نے دیکھا کہ اس نے ایک نہایت خوب صورت

عورت کا پُتلا بنایا ہے۔ اس کے سر پر ٹوپی تھی، لمبے گھُنگریالے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے اور بائیں ہاتھ میں ایک ڈھال تھی۔ جس پر مدوسا چُڑیل کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ سو سانپ زبانیں نِکالے اُس کے سر پر لہرا رہے تھے۔ اس عورت کا دایاں (یعنی سیدھا) ہاتھ آگے کی طرف اِشارہ کر رہا تھا۔



جیسن نے سوچا کہ یہ تو دیوی ایتھنے ہے۔ سمندروں کی دیوی۔ وہ بُہت خُوش ہوا

کہ اب اس کے جہاز کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

لکڑی کے اس پُتلے کو جہاز کے آگے لگانے کے بعد جیسن نے کہا۔ "مجُھے درخت سے جا کر پُوچھنا چاہیے کہ اب کیا کروں؟"

وہ جانے کے لیے مُڑا ہی تھا کہ آواز آئی۔ "اب وہاں جانے کی ضرُورت نہیں۔ مُجھ سے پوچھو۔ میں بتاؤں گی۔" جیسن نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ یہ تو اُسی عورت کی آواز تھی جس کی مُورتی جہاز پر لگی ہوئی تھی۔ اب جیسن کی سمجھ میں ساری بات آ گئی۔ وُہ بُہت خُوش ہوا کہ بولنے والے درخت کی ایک شاخ اس کے جہاز میں ہے۔ اب تو جہاں جہاں آرگو جہاز جائے گا، اُس کے ساتھ بولنے والا درخت بھی جائے گا۔

اُس نے مُورتی سے کہا۔ "جہاز کے پچاس چپّو چلانے کے لیے میں پچاس تجربہ کار ملّاح کہاں سے لاؤں؟ مجُھے عام ملّاح نہیں بلکہ ایسے نوجوان چاہیں جو بُہت بہادُر اور صحت مند ہوں۔ راستے میں خُدا جانے کیا کیا حادثے پیش آئیں۔ کیسی کیسی مُہمّیں سر کرنی پڑیں۔ اگر اچھّے ساتھی نہ ملے تو ہم کبھی سُنہری اُون لانے میں

کامیاب نہ ہوں گے۔"

بولنے والے درخت کی مُورتی بولی۔ "یُونان کے بہادُر اور نِڈر نوجوانوں کو دعوت دو۔ اِعلان کر دو کہ ہم سُنہری اُون کی مُہم پر جا رہے ہیں۔ جو نوجوان ساتھ دینا چاہیں، آگے آئیں۔ "

جیسن نے اُسی وقت یُونان کے ہر شہر اور قصبے میں اِعلان کروا دیا۔ اِعلان کرنے والوں نے لوگوں کو بتایا کہ جیسن اپنی جان خطرے میں ڈال کر سُنہری اُون لانے جا رہا ہے اور اُسے اُنچاس بہادُر ساتھیوں کی ضرُورت ہے۔ (پچاسواں جیسن خُود تھا)۔

یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح جلد ہی سارے یُونان میں پھیل گئی اور مُلک بھر سے نِڈر اور بہادُر نوجوان جیسن کے پاس آنے لگے۔ اُن میں کئی نوجوان جیسن ہی کی طرح چِرن کے شاگرد تھے۔ وہ دیووں اور چُڑیلوں سے لڑ چُکے تھے اور بہت سی خطرناک مُہمّوں کو سر کر چُکے تھے۔ ان میں ہرکولیس بھی تھا اور کیسٹر جیسا بہادُر نوجوان بھی۔

اِن میں آرفس بھی تھا جو اِتنی عُمدہ بانسری بجاتا تھا کہ اِنسان تو اِنسان جانور بھی کھنچے چلے آتے اور جدِھر وہ جاتا، وہ بھی پیچھے پیچھے ہو لیتے۔

ان کے عِلاوہ ان میں ایک بہادُر لڑکی اتلانتا بھی تھی، جسے کِسی پہاڑ کے غار میں ایک ریچھ نے پالا تھا۔ وہ ہرن سے بھی زیادہ تیز دوڑتی تھی اور اُس کے پاؤں اتنے ہلکے پھُلکے تھے کہ وُہ سمندر کی لہروں پر ایک کے بعد دُوسرا قدم رکھتی چلی جاتی لیکن سوائے جُوتے کے تلے کے اور کوئی چیز نہ بھیگتی۔ ریچھوں میں پلنے والی لڑکی کِتنی وحشی اور بہادُر ہو گی، اِس کا اندازہ آپ خود کر لیں۔ اُسے شکار کا بُہت شوق تھا اور کھانا پکانے اور سینے پرونے سے نفرت تھی۔

ان نوجوانوں میں شِمالی ہوا کے دو بیٹے بھی تھے جنہوں نے اپنے کندھوں پر پَر لگا رکھے تھے اور دریاؤں اور ندی نالوں کو اُڑ کر عبُور کر لیتے تھے۔ اِسی طرح اور بھی جتنے نوجوان تھے سب کے سب بہادر، تجربہ کار اور کِسی نہ کِسی کام میں ماہر تھے۔

جب جیسن نے اُنچاس ساتھی چُن لیے تو سب نے ایک ایک چپُّو سنبھال لیا اور چلنے کے لیے تیّار ہو گئے۔ جہاز کنارے پر تھا۔ اُنہوں نے بُہت کوشش کی کہ

اُسے گہرے پانی میں لے جائیں لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہُوا۔ ایسا محسُوس ہوتا تھا جیسے جہاز کو کسی نے پکڑ رکھا ہو۔

جیسن نے لکڑی کی مُورتی سے پُوچھا کہ اب کیا کِیا جائے؟ اُس نے جواب دیا کہ جب تک آرفس بانسری نہیں بجائے گا، جہاز اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرے گا۔ آرفس نے بانسری بجائی اور پچاس نوجوانوں نے اکٹھّے چپُّو چلائے تو جہاز چل پڑا اور آہستہ آہستہ گہرے پانی میں پہنچ گیا۔

ان بہادُر لوگوں کو اَلوِداع کہنے کے لیے ساحِل پر لوگوں کا ہُجُوم اکٹھّا ہو گیا تھا۔ اگر نہیں آیا تھا تو پیلاس بادشاہ جو اپنے محل کی بالکونی میں کھڑا ناک بھُوں چڑھا رہا تھا۔ اُس کا دل چاہتا تھا کہ اِس جہاز کو تباہ کر دے اور ساتھ ہی اِن سب لوگوں کو بھی جو جیسن کی کام یابی کی دُعا کر رہے تھے۔

سفر کے دَوران میں سب لوگ سُنہری اُون کی باتیں کرتے رہے۔ اُن میں سے اکثر نے سُنہری اُون کے متعلق سُنا تو تھا لیکن کِسی نے اُسے دیکھا نہ تھا۔ اس لیے سب ہی اس انوکھی چیز کو دیکھنے کے لیے بے چین تھے۔

یہ سُنہری اُون دراصل ایک ایسی بھیڑ کی اُون تھی جس نے کسی زمانے میں اپنی جان دے کر دو بہن بھائیوں کی جان بچالی تھی۔ یہ دونوں بہن بھائی بچّے ہی تھے۔ سیلاب آیا تو پانی میں بہہ گئے۔ یہ بھیڑ بھی پانی میں بہتی چلی آرہی تھی۔ بچّوں کو روتا دیکھ کر وہ تیرتی ہوئی اُن کے پاس گئی اور دونوں بچّوں کو اپنی پیٹھ پر سوار کر لیا۔

دونوں بہن بھائیوں نے بھیڑ کی اُون کو مضبُوطی سے پکڑ لیا اور وُہ بہتے چلے گئے۔ لڑکی تو اُس جگہ ڈُوب گئی جہاں یورپ اور ایشیا کی سرحدیں ملتی ہیں لیکن لڑکا بھیڑ کی اُون سے چمٹا رہا اور خیریت سے خُشکی پر پہنچ گیا۔

اِتنے لمبے سفر کے بعد بھیڑ کی طاقت جواب دے گئی تھی۔ خُشکی پر پہنچ کر وہ ریت پر لیٹی اور وہیں مر گئی۔ اتنے بڑے کارنامے پر قدرت نے اُس کی اُون کو سونے کا بنا دیا۔ وہ دِن اور آج کا دِن لوگ اُس سُونے کے خزانے کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن کِسی شخص کو کامیابی نہ ہوئی۔ اس لیے کہ سونے کی یہ اُون ایک درخت پر لٹکی ہوئی تھی اور درخت کے نیچے ایک خوف ناک اژدھا

پہرا دیتا تھا۔ پھر بھی سونے کے شوقین بادشاہ اور بہادُر نوجوان اِس خزانے کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔

جس بچّے کو بھیڑ نے بچایا تھا، وہ بعد میں ایک مُلک کا بادشاہ بنا۔ یہ جہاز اُس مُلک سے گزرا تو اُس بادشاہ کی اولاد میں سے دو شہزادے بھی سفر میں شریک ہو گئے۔ اُنہیں پتا تھا کہ سُنہری اُون کِس مُلک میں ہے۔ وہ راستہ بتاتے گئے اور آخر جہاز اُس مُلک کے ساحل پر ٹھہر گیا۔ اس مُلک کا بادشاہ سرس جادُوگرنی کا بھائی تھا۔ بڑا ہی ظالم اور وحشی۔ اس کی خواہش تھی کہ سُنہری اُون اُسے مل جائے۔

اُس نے جیسن سے کہا۔ ”تُمھیں پتا ہے کہ سُنہری اُون حاصل کرنے کے لیے تُمھیں کِن مُشکلوں سے گُزرنا پڑے گا؟“

جیسن بولا۔ ”میں نے سُنا ہے کہ سُنہری اُون ایک کے درخت پر لٹکی ہوئی ہے جس کے نیچے ایک خوف ناک اژدھا رہتا ہے۔ کہتے ہیں وہ اژدھا اِتنا بڑا ہے کہ پُورے آدمی کو ایک ہی لُقمے میں نِگل جاتا ہے۔“

بادشاہ بولا ”تُم نے ٹھیک سُنا ہے۔ لیکن اژدہے تک پُہنچنے سے پہلے تُمھیں کُچھ اور

کام بھی کرنے ہوں گے۔ پہلے تُمہیں میرے دو بیلوں کو سَدھانا ہو گا۔ یہ تانبے کے بیل ہیں اور ان کے پیٹ میں آگ کا الاؤ جل رہا ہے۔ اُن کے مُنہ اور نتھنوں سے ہر وقت شُعلے نکلتے رہتے ہیں۔ اُن کے پاس جانا اپنے آپ کو جلا کر کوئلا بنا دینے کے برابر ہے۔ کیا خیال ہے؟"

جیسن بولا "دیکھا جائے گا۔ سُنہری اُون حاصل کرنے کے لیے جس مُشکل سے بھی گُزرنا پڑا، گُزروں گا۔"

بادشاہ نے کہا "اِن بَیلوں کو سَدھلنے کے بعد تُمہیں ان سے کھیت میں ہل چلانا ہو گا اور پھر کھیت میں اژدہے کے دانت بونا ہوں گے۔ ان دانتوں سے کھیت میں سپاہی اُگیں گے۔ تُمہیں اُنہیں شکست دینا ہو گی۔"

یہ کہہ کر بادشاہ نے جیسن کو غور سے دیکھا اور پھر کہا۔ "شہزادے جیسن، کل تُمہاری آزمائش ہو گی۔ آج تُم آرام کرلو۔"

جب بادشاہ جیسن سے باتیں کر رہا تھا تو جیسن کو ایک خُوب صُورت لڑکی تخت کے پیچھے بیٹھی نظر آئی تھی۔ بادشاہ نے اپنی بات ختم کی تو جیسن باہر نِکل گیا۔

لڑکی بھی اُس کے پیچھے پیچھے آئی اور بولی :

"میرا نام میدیا ہے۔ میں بادشاہ کی لڑکی ہُوں۔ اگر میرے کہے پر عمل کرو گے تو بَیلوں کو بھی آسانی سے سَدھا لو گے اور کھیت میں اژدہے کے دانت بھی بو سکو گے۔ "

جیسن بولا۔ "اے شہزادی، تُم بہُت عقل مند نظر آتی ہو۔ اگر تُم میری مدد کر سکو تو میں تُ ُمام عُمر تُمہارا اِحسان مند رہوں گا۔ تُم جادُو جانتی ہو؟"

"ہاں، شہزادے جیسن۔ میں جادُو گرنی ہُوں۔ تُم نے میری پھُوپھی کا نام سُنا ہے؟ سرس اُس کا نام ہے۔ اُسی نے مُجھے جادُو کا عِلم سِکھایا ہے۔ مُجھے اس بُوڑھی عورت کا نام بھی معلُوم ہے جس کے ساتھ مور تھا اور جسے تُم نے اپنی پیٹھ پر اُٹھا کر دریا پار کرایا تھا۔ مُجھے اس شخص کا بھی علم ہے جو تمہارے جہاز پر لگی ہوئی عورت کے پُتلے کے مُنہ سے بولتا ہے۔ اگر تُم واقعی بہادُر ہو تو خُوشی سے تُمہاری مدد کروں گی۔ سب سے پہلے تو تم یہ مرہم لو۔ اسے اپنے جسم پر مل لینا۔ بَیلوں کے مُنہ اور نتھنوں سے نکلنے والے شُعلے تُمہارا کُچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔ "

یہ کہہ کر میدیا نے ایک سُنہری ڈبیا جیسن کو دی پھر وُہ جگہ بتائی جہاں اُسے رات کو جیسن سے ملنے آنا تھا۔ آخر میں بولی :

"حوصلہ رکھو۔ ہمّت نہ ہارو۔ آگ کے بیل صُبح سے پہلے پہلے سَدھائے جا چُکے ہوں گے۔"

جیسن نے میدیا کو یقین دِلایا کہ وہ حوصلہ ہارنے والا نہیں ہے۔ پھر اُس نے جہاز پر جا کر ساری بات ساتھیوں کو بتائی اور اُنہیں اگلے دِن تیّار رہنے کو کہا کہ شاید اُن کی مدد کی ضرُورت پڑ جائے۔ رات کو میدیا نے اژدہے کے دانتوں سے بھری ایک ٹوکری جیسن کو دی اور پھر اسے لے کر کھیتوں کی طرف روانہ ہو گئی۔ ایک کھیت کی طرف اِشارہ کر کے اُس نے کہا :

"وہ ہیں آگ کے بَیل۔ خیال رکھنا۔ وُہ بہُت مُنہ زور ہیں۔"

جیسن تیزی سے آگے بڑھا، اندھیرے میں اُسے آگ جلتی بُجھتی نظر آئی۔ یہ بیلوں کے نتھنوں اور مُنہ سے نکلنے والے شُعلے تھے۔ جیسن کو دیکھتے ہی بَیل اُس کی طرف دوڑے۔ ہر طرف روشنی ہو گئی۔ درختوں کے پتّے جلنے لگے۔ لیکن

جیسن کو کوئی نقصان نہ پہنچا۔ یہ مرہم کا اثر تھا۔

جیسن نے موقع پاکر ایک بَیل کے سِینگ اور دُوسرے کی دُم پکڑلی۔ اس کی کام یابی کا اصل راز اُس کا حوصلہ اور جرأت تھی۔ جلد ہی بَیلوں کی طاقت ختم ہو گئی اور جیسن نے اُنھیں ہل میں جوت دیا۔

صُبح ہونے سے پہلے پہلے جیسن نے کھیتوں میں ہل چلا کر اژدہے کے دانت بو دیے۔ یہ کام اُس نے چاند کی چاندنی میں کیا۔ ہل چلا کر وہ میدیا کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور بولا:

"اب ہمیں کتنے دِن اِنتظار کرنا پڑے گا؟ خُدا جانے فصل کب اُگے۔"

میدیا بولی۔ "وُہ دیکھو۔۔۔"!

جیسن نے دیکھا کہ پہلے کھیتوں میں شبنم سی چمکتی نظر آئی۔ پھر یہ شبنم چمکتے ہوئے نیزے بن گئے۔ پھر ٹوپیاں نظر آئیں۔ تھوڑی دیر بعد ہر اُس جگہ جہاں اژدہے کے دانت بوئے گئے تھے، لمبے تڑنگے سپاہی، نیزے، تلوار، ڈھال لیے

کھڑے تھے۔ لڑنے کے لیے بالکل تیّار۔

سپاہی چلّائے۔ ''ہمارادُشمن کہاں ہے؟'' اس کے ساتھ ہی اُن کی نظر جیسن پر پڑی اور وہ سب اُس کی طرف دوڑے۔

میدیا نے ایک پتھّر جیسن کو دیتے ہوئے کہا: ''یہ پتھّر اِن پر پھینکو۔''

جیسن نے پتھّر پھینکا تو وہ ایک سپاہی کی ٹوپی سے ٹکرا کر دوسرے کی ڈھال پر لگا اور پھر تیسرے کے چہرے سے جا ٹکرایا۔ اس پر وہ تینوں ایک دُوسرے سے لڑنے لگے۔ اس لڑائی میں دُوسرے تمام سپاہی بھی شامل ہو گئے اور پھر جتنی تیزی سے وہ زمین سے نکلے تھے، اتنی ہی تیزی سے زمین پر آ رہے۔ سب مر گئے۔

بادشاہ کو یقین نہ آیا کہ جیسن نے یہ سب کُچھ اکیلے ہی کیا ہے۔ اب اُس نے ایک اور شرارت سوچی۔ لیکن میدیا کو جادُو کے ذریعے اِس شرارت کا پتا چل گیا۔ اُس نے جیسن سے کہا :

"کل رات تُمہارے جہاز کو آگ لگا دی جائے گی۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ تُم آج رات سُنہری اُون حاصل کر و اور کل دوپہر کو یہاں سے واپس چلے جاؤ۔" یہ کہہ کر وہ رات کو آنے کا وعدہ کر کے چلی گئی۔

رات کو میدیا جیسن کو لے کر ایک گھنے جنگل میں گئی۔ اندھیرے میں اُنہیں ایک چاند سا نظر آیا۔ میدیا بولی:

"وہ ہے سُنہری اُون۔۔۔"

جیسن نے دیکھا کہ وہ چاند نہیں تھا بلکہ سُنہری اُون کی چمک تھی۔ اسی وقت ایک ہرن اُدھر سے گزرا لیکن پھر ایک پھنکار کی آواز آئی اور اُون کی چمک میں اُنہوں نے دیکھا کہ اژدھے نے ہرن کو ثابت نِگل لیا ہے۔

جیسن نے اپنی تلوار نِکالی تو میدیا بولی۔ "ٹھہرو۔۔۔"!

میدیا کی آواز اژدہے نے سُن لی تھی۔ وہ بڑا سا مُنہ کھول کر اُن کی طرف بڑھا۔ یہ دیکھتے ہی میدیا نے جیب سے ایک سنہری ڈبیا نکالی اور اژدہے کے مُنہ میں پھینک

دی۔ اژدہے نے مُنہ بند کر لیا۔ ساتھ ہی اُس کا جسم تیزی سے بَل کھانے لگا، جیسے اُس نے آگ کا گولا نِگل لیا ہو۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ بے سُدھ ہو کر زمین پر لیٹ گیا۔

میدیا بولی اژدہے کو مارنا اچھّا نہیں ہوتا، اس لیے میں نے اُسے نیند کی گولی دی ہے۔ اب تم جلدی کرو اور سُنہری اُون اُٹھا لو۔“



جیسن نے لپک کر سُنہری اُون اُٹھائی اور اُس کی روشنی میں تیز تیز قدم اٹھاتا جنگل سے نِکل آیا۔ راستے میں اُسے وہی بُڑھیا ملی جس کے ساتھ مور تھا۔ اس نے جیسن کو شاباش دی اور اُسے لے کر جہاز کی طرف دوڑی۔ وقت بہت کم تھا۔ ایک گھنٹے بعد سُورج نکلنے والا تھا۔

جیسن کو دیکھتے ہی لکڑی کی مُورتی چِلّائی۔ ''جیسن! جلدی کرو۔''

جیسن کُود کر جہاز میں داخل ہُوا تو اُس کے ساتھیوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ اُنہوں نے جی بھر کر سُنہری اُون کو دیکھا اور پھر واپس چل دیے۔

جب اُن کا جہاز الکوس کے ساحل پر رُکا تو وہاں پیلاس کی موت کا سوگ منایا جارہا تھا اور لوگ جیسن کا اِنتظار کر رہے تھے۔

جیسن نے اپنے تخت پر قبضہ کر لیا اور اُن انچاس نوجوانوں کو بڑے بڑے عہدے دیے جو اُس کے ساتھ سُنہری اُون لینے گئے تھے۔